THE BOOK WAS DRENCHED

احوال و آثارِ

خان آرزو

(۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء - ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء)

ڈاکٹر ریحانہ خاتون

شعبۂ فارسی

دانشگاہ دہلی ———— دہلی

ناشر

انڈو پرشین سوسائٹی

۱۸۳۸، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں، دہلی-۶

احوال و آثارِ خان آرزو

مصنف : ـــــــــ ڈاکٹر ریحانہ خاتون

سال طباعت ـــــــــ ۱۹۸۷ء

ناشر : انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۳۸،
شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی - ۱۱۰۰۰۶

مطبع :- فوٹو لیتھو ورکس سیتاپوری دہلی ۳۲

قیمت : ۵۰ روپے

امّی مرحومہ کی نذر

تعارف

سراج الدین علی خان آرزو (متوفی: ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء)

ہندستان میں فارسی زبان وادب کے ایک مایۂ ناز اور کثیر التصانیف عالم ہیں۔ آپ نے فارسی شعرا کے تذکرے لکھے، فارسی کی اہم کتابوں کی شرحیں لکھیں، دوسروں کی تصانیف پر ادبی اور علمی تنقید کی اور فارسی زبان کے قواعد پر کتابیں لکھیں اس کے علاوہ دیگر دلچسپ اور اہم موضوعات پر مختلف عنوانات سے اپنے خیالات کا اظہار کیا آپ ایک پرگو شاعر بھی تھے۔ نیز آپ کے دواوین کتب خانوں کی زینت ہیں۔ آپ نے بعض دواوین فارسی کے اساتذہ شعرا کے جواب میں ترتیب دیے ہیں۔ ان دواوین سے آپ کی شاعرانہ مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آرزو کی علمی کوششوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیے تو بآسانی احساس ہو جاتا ہے کہ ان کی دلچسپی کا اصل موضوع فرہنگ نویسی یا لغت نویسی ہے۔ ان کی سراج اللغۃ، چراغ ہدایت، نوادر الالفاظ، زاید الفواید ایسی فرہنگیں ہیں جو فارسی کے طلبا و اساتذہ کے لیے عرصہ سے توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ اسی ضمن میں ایک دوسری کتاب مثمر ہے، جو اپنے موضوع اور مطالب کے لحاظ سے فارسی زبان و تاریخ میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں آرزو ہندستان میں ایک ایسی کتاب کی ترتیب میں مشغول تھے جس میں فارسی، ہندی، ترکی اور عربی کے ایک دوسرے سے گہرے اور قدیمی تعلق و رشتے پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا ہے اس زمانے تک کسی نے آپ کے انداز میں فارسی اور ہندی وغیرہ کے لسانی

تعلق پر علمی نقطۂ نگاہ سے روشنی نہیں ڈالی تھی۔ مثمر، آرزو کی ایسے ہی تحقیقی نظریات پر مشتمل ہے۔

ایرانیوں کا غالباً ہمیشہ سے یہ رویّہ رہا ہے کہ انہوں نے غیر ملکی فارسی دانوں کی علمی و ادبی کوششوں کو وہ اہمیت نہیں دی جس کی وہ حقدار ہیں علی حزین نے ایرانیوں کے اس رویّے کا اپنی تحریروں میں اظہار کیا ہے۔ یہ رویّہ غیر علمی اور بے بنیاد تھا جس کے جواب میں ہندستان کے فارسی علما نے بھی اپنے دفاع میں قلم اٹھایا۔ آرزو ان چند معتبر اور صاحب نظر علما میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے ہندستان کے فارسی شعرا اور ادبا کی کوششوں کو علمی بنیاد پر پرکھا نیز ہندستانی فارسی زبان و ادب کی ارزش، قدر و منزلت اور اہمیت کو عالمانہ انداز میں متعارف کرایا۔ آپ کی اس علمی خدمت کا مطالعہ کرنا باقی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے سراج الدین علی خان آرزو کی زندگی اور آثار پر نسبتاً تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ کوشش قابل قدر ہے چونکہ اس میں تحقیقی رویہ اپنایا گیا ہے اور آرزو کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر متوازن انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے مثمر سے متعلق اس کتاب کا حصّہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ 'مثمر' کی علمی و ادبی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے یہ سب سے پہلی مفصل کوشش ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ فارسی زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے اردو داں حضرات بھی اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے نیز آرزو کی علمی جد و جہد کو سمجھنے میں یہ کتاب بڑی حد تک مدد دیگی

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

(پروفیسر امیر حسن)

شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

عرض مصنف

کئی سال کی پیہم جستجو کے بعد ۱۹۸۰ء میں راقم کو علی گڑھ یونیورسٹی نے خان آرزو کی لسانیات کی کتاب "مثمر" کے تنقیدی جائزہ اور ترتیب پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ میں اپنی یہ حقیر کوشش شایع کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش نہیں کر سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ میری یہ کوشش جلد ہی منظر عام پر آ جائے گی۔

پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھنے کے دوران ظاہر ہے کہ مجھے خود خانِ آرزو کے حالاتِ زندگی اور ان کے مختلف ادبی، تاریخی، علمی اور فنّی کارناموں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ میں نے اس پہلو پر بھی حتی المقدور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خان آرزو اٹھارھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم فارسی عالم ہیں۔ انہوں نے فارسی علم و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بیک وقت شاعر، ادیب، ماہر لسانیات، نقاد، شرح نگار، لغت نویس غرض یہ کہ بہت کچھ تھے ان کو چار زبانوں پر مہارت حاصل تھی جن میں فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت شامل ہیں۔ یہ اس زمانے کے مختلف تقاضوں کو اس خوبی سے نبھاتے

تھے کہ کبھی کسی موقع پر ٹکراؤ یا تضاد پیدا نہ ہوا۔ انھوں نے تماشاگاہ عالم کو ہر پہلو سے دیکھا۔ کبھی شاعری کے میدان میں اپنے فن اور موزونئ طبع کا مظاہرہ کیا تو کبھی ادیب بنکر سامنے آئے، کبھی زبان شناسی اور فرہنگ نویسی کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے تو کبھی نقاد بن کر اُبھرے اور تنقید کے میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ خود اُن کی زندگی کی صحیح تصویر کشی کے لیے بھی ہمیں جستجو کرنی پڑی ہے پیش نظر صفحات میں خان آرزو کی زندگی اور ان کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے میری اس کوشش سے یہ بات بھی مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے بعد حالانکہ فارسی زبان و ادب کی سرپرستی میں وہ سرگرمی نہ رہی تھی جو اس سے پہلے کے مغل دور میں موجود تھی اور جس کی وجہ سے ایران کے شعرا، علما اور فضلا بڑی تعداد میں ہندستان آکر مقیم ہو گئے تھے اس کے باوجود اس دور میں بھی خانِ آرزو جیسے علمائے ادب ہندستان میں جنم لیتے رہے اور فارسی زبان و ادب کی ہر میدان میں گراں قدر خدمت انجام دیتے رہے۔

مجھے فخر ہے کہ میں ہندستان کے ایک مایۂ ناز محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب قبلہ کی لڑکی ہوں۔ میرے والد نے ویسے تو ہر قدم پر تعلیمی میدان میں ہم سب بہن بھائیوں کی رہنمائی فرمائی ہے، لیکن جیسا میں نے پی، ایچ، ڈی کے لیے خانِ آرزو کی مثمر ترتیب دینے کا فیصلہ کیا تو مجھے جو راہنمائی اپنے والد صاحب قبلہ سے ملی اس کا ذکر ممکن نہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ میرے والد صاحب کی تحقیقی اور علمی سرگرمیاں لغت سے نسبتاً زیادہ متعلق ہیں اس وجہ سے ان کی راہنمائی اور وسیع مطالعہ

اور شفقت و محبت نے میرے لیے تحقیقی کاموں میں آسانیاں فراہم کیں اور پیش نظر صفحات میں بھی ان کی تجاویز، مشورے اور علم کو بہت بڑا دخل ہے۔ اگر اولاد کے لیئے اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا مناسب نہ معلوم ہو تو میں اپنے والد صاحب کی راہنمائی اور شفقت کا دل سے اعتراف اور شکریہ ادا کرتی ہوں اور صحت و عافیت کے ساتھ ان کی درازی عمر کے لیے خداوند کریم کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں

میں اپنے استاد ڈاکٹر شریف حسین قاسمی صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اس کام کے مکمل کرنے میں بھرپور تعاون دیا اور اپنا قیمتی وقت نکال کر میری مدد کی۔

مجھے امید ہے کہ اہل علم حضرات میری اس ناچیز کوشش کو سراہیں گے اور مجھے میری کوتاہیوں سے بھی آگاہ کریں گے۔

(ڈاکٹر) ریحانہ خاتون

شعبۂ فارسی
دہلی یونیورسٹی
دہلی

سراج الدین علی خان آرزوؔ :۔ احوالِ زندگی

دہلی کی سرزمین کو قدامت اور مرکزیت کے اعتبار سے ہمیشہ امتیاز حاصل رہا ہے، اس کی ادبی اور علمی عظمت بھی ہر دور میں برقرار رہی ہے۔ دہلی کی آغوش میں ایسے شاعر اور ارباب فضل وکمال موجود رہے ہیں جن کے فن کا سکہ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرونِ ہند میں بھی چلتا رہا ہے۔ امیر خسرو اور امیر حسن کے نام سے دہلی کی تاریخ ابد تک روشن رہے گی۔ سلاطین تیموریہ کے عہد حکومت میں بھی دہلی نے دنیائے علم کو بڑے بڑے صاحبانِ کمال سے روشناس کرایا اور یہ سلسلہ میر، سودا، غالب اور مومن ہی تک جاری نہیں رہا بلکہ اب بھی منقطع نہیں ہوا۔ اکبر کے عہدِ حکومت سے محمد شاہ کے زمانے تک اگر صرف ممتاز شعرا کے ہی نام شمار کیے جائیں تو اسکی فہرست کافی طویل ہو گی۔ شعرا کی قدردانی اور انکی عزت افزائی کے تاریخی افسانے اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں چغتائی سلاطین کے سلسلہ میں صرف اورنگ زیب کی شخصیت ایسی ہے جس کو فنونِ لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس کا دورِ فرمانروائی ان فنون کے لیے ایک حد تک کس مپرسی کا دور تھا۔ سرکاری طور پر فنکاروں کی کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی تھی بلکہ ملک الشعرا کا عہدہ بھی ختم کر دیا گیا تھا لیکن ان اسباب سے علوم وفنون کا ارتقا رک نہیں سکتا تھا۔ ہر نظام اور ہر سماج میں ادیب اور فنکار پیدا ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے ان کے نقوشِ قدم سے

وقت کے نوادرات رنگ نہ اپنی پیشانی بچا سکے تھے اور نہ آیندہ بچا سکیں گے۔ زمانہ انہیں جنم دیتا رہے گا اور وہ وقت کے ساز پر اپنا پیغام الاپتے رہیں گے چنانچہ اورنگ زیب کی بے التفاتی کے باوجود دہلی میں شاعری کی شمع روشن رہی۔ ناصر علی اور مرزا عبدالقادر بیدل اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو ملک الشعرائی کا منصب حاصل نہیں ہوا مگر ان کے کلام کا سکہ آج بھی رواں ہے جبکہ شہنشاہ اورنگ زیب کی ٹکسال میں ڈھالے ہوئے سونے اور چاندی کے سکے کہیں نظر نہیں آتے۔ بیدل کا چراغ تو مرزا غالب تک روشن رہا۔ غالب کی ابتدائی شاعری پر بیدل کے گہرے نقوش موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دور شعور سے لیکر آخر تک بیدل کے اسلوب کو محو نہیں کر سکے۔ ان کے کلام میں کہیں نہ کہیں بیدل کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے بیدل نے لمبی عمر پائی اور محمد شاہ کے آغازِ جلوس تک زندہ رہے یہ وہ زمانہ تھا جب طاہر نصر آبادی اصفہان میں بیٹھے تذکرۂ شعرا مرتب کر رہے تھے، جس میں ایک باب شعرائے ہند کے لیے بھی مخصوص کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی بعض تذکرہ نویس مثلاً عوفی، دولت شاہ اور میر تقی کاشی نے اپنے تذکروں میں ہندستان کے شعرا کا ذکر کیا تھا۔

خان آرزو کا پورا نام سراج الدین علی استعداد خان تھا۔ ان کا تخلص آرزو اور یہ خان آرزو کے نام سے جانے جاتے ہیں عہد محمد شاہی کے سخنوروں میں اور اپنے عہد کی مشہور شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا سب سے ممتاز پہلو ان کی ہمہ گیری ہے وہ بیک وقت شاعر، ادیب، ماہر لسانیات، نقاد، شرح نگار،

لغت نویس، غرض یہ کہ بہت کچھ تھے۔ ان کو چار زبانوں پر مہارت حاصل تھی جن میں فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت شامل ہیں۔ یہ اس زمانے کے مختلف تقاضوں کو اس خوبی سے نبھاتے تھے کہ کبھی کسی موقع پر ٹکراؤ یا تضاد پیدا نہ ہو۔ انہوں نے تماشا گاہِ عالم کو ہر پہلو سے دیکھا۔ کبھی شاعری کے میدان میں اپنے فن اور موزونی طبع کا مظاہرہ کیا تو کبھی ادیب بنکر سامنے آئے کبھی زبان شناسی اور فرہنگ نویسی کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے تو کبھی نقاد بنکر ابھرے اور تنقید کے میدان میں فن کا کمال دکھایا۔

میر محمد افضل ثابت الہ آبادی، مرزا عبد الغنی قبول کشمیری اور مرزا مظہر جانِ جاناں ان کے ہمعصروں میں تھے۔ ان کا فیض تربیت مرزا رفیع سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد تک کارفرما رہا ہے بلکہ اردو کے زلف وگیسو کی دلکشی اور رعنائی کے پیچھے آرزو کی فنکاری اور چابکدستی کو بھی خاصہ دخل ہے۔ وہ شعرا آرزو ہی کی تربیت کردہ تھے جن کی بدولت اس مقبول عام زبان کو ضلع جگت اور ذو معنی الفاظ سے نجات ملی اور آہستہ آہستہ وہ فارسی کے اسلوب اور انداز بیان کا آئینہ بن گئی۔

ہمارے پاس بہت سا ایسا مواد موجود ہے جس سے آرزو کے حالاتِ زندگی کا تجزیہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے اور ان کے ادبی وعلمی کارناموں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا سب سے پہلا ماخذ ان کا اپنا تذکرہ "مجمع النفائس" ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہمعصر اور شاگردوں نے بھی ان کے متعلق بہت سی اہم معلومات بہم پہونچائی ہیں ان میں غلام علی آزاد بلگرامی مرتب سرو آزاد

اور خزانۂ عامرہ اور بندرا بن داس خوشگو متخلص بہ خوشگو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ خوشگو آرزو کے شاگرد بھی تھے اس لیے ان کے بارے میں معتبر معلومات رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ان کے استاد کا ایک خط بھی تھا جس میں ان کے حالات زندگی اور تصانیف کے سلسلہ میں بہت سی اہم معلومات درج تھیں۔ آزاد آرزو کے ہم عصر ہیں ان کو بھی آرزو کے حالاتِ زندگی خود آرزو کے ایک خط کے ذریعہ معلوم ہوئے تھے جو انہوں نے آزاد بلگرامی کو اس وقت لکھا تھا جب وہ اپنا تذکرہ سروِ آزاد (۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء) تکمیل کر رہے تھے۔ آزاد نے اپنے دوسرے تذکرہ خزانۂ عامرہ (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) میں اس خط کا دوبارہ ذکر کیا ہے جس سے ان کو آزاد کے حالات زندگی کا پتا چلتا ہے۔ والہ داغستانی جو آرزو کے ہمعصر ہیں جب اپنی تصنیف ریاض الشعرا (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۷ء) آرزو کی مجمع النفائس کی تکمیل سے تقریباً تین سال قبل مکمل کر رہے تھے اس میں آرزو کا تذکرہ کیا ہے اگرچہ وہ مجمع النفائس سے استفادہ نہ کر سکے تھے لیکن انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے اعتبار اور استناد میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ بہر حال آرزو نے جو کچھ بھی اپنے متعلق مجمع النفائس میں لکھا ہے وہ ان کی سوانح حیات کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور سنگِ میل کا کام دیتا ہے۔ مجمع النفائس میں جو کچھ اطلاعات ہیں وہی اطلاعات خوشگو، آزاد، والہ اور دوسروں کے یہاں بھی موجود ہیں۔

آرزو کی اوائل زندگی کے متعلق ان کے تذکرہ مجمع النفائس،

سفینۂ خوشگو، خزانۂ عامرہ اور سروِ آزاد سے کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ انہوں نے مجمع النفائس میں اپنی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، لیکن خوشگو نے ان کی جائے پیدائش اکبر آباد بتائی ہے① غالباً یہیں سے معلومات فراہم کر کے ریو نے برٹش میوزیم کٹیلاگ اور عبدالمقتدر نے بانکی پور کٹیلاگ (جلد ہفتم) میں آگرہ یا اکبرآباد کو آرزو کی جائے پیدائش بتایا ہے سی۔ اے۔ اسٹوری کے پاس چونکہ سفینۂ خوشگو نہ تھا۔ اس لیئے وہ یہ نہ جان سکے کہ عبدالمقتدر اور ریو نے اس خیال کو کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اسٹوری نے لکھا ہے کہ غالباً ان دونوں بزرگوں نے سروِ آزاد کی ہی بنیاد پر آرزو کو اکبرآبادی لکھا ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آرزو گوالیار میں پیدا ہوئے چنانچہ آرزو کے معاصر حسین دوست سنبھلی اپنے تذکرہ حسینی میں آرزو کی جائے پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"شمع شبستانِ افسانہ گفتگو سراج الدین علی خان آرزو سلمہ اللہ وطنش گوالیار است و منشاء اکبرآباد"

تذکرۂ حسینی کے مصنف آرزو کے ہمعصر ہیں اور ان کا یہ تذکرہ آرزو کے مجمع النفائس سے ایک سال قبل یعنی ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں مکمل ہوا۔ "خجستہ انجام" تاریخ اتمام ہے۔ ایسی صورت میں آرزو کی وطنیت کا غلط انتساب حیرت انگیز ہے۔

۱۔ منوہر سہائے کا تحقیقی مقالہ ص ۶۲

حیرت[1] اور علی ابراہیم خاں[2] خلیل نے اپنی کتاب صحف ابراہیم میں آرزو کی جائے پیدائش گوالیار بتائی ہے۔ اشپوری اس بیان کو درست مانتے ہیں کیونکہ یہ بیان ایک قدیم تذکرہ سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ خوشگو جو کہ آرزو کے نہ صرف ہمعصر اور شاگرد تھے بلکہ ان کے پاس آرزو کا سوانحی خاکہ بھی موجود تھا، وہ صاف طور پر آرزو کی جائے پیدائش آگرہ ہی بتاتے ہیں۔ اور ان کا بیان ابراہیم خاں خلیل کے صحف ابراہیم سے زیادہ مستند اور قابلِ اعتبار ہے۔ کیونکہ صحف ابراہیم آرزو کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اِن دونوں بیانات کی روشنی میں یہ زیادہ قابل اعتبار ہے کہ آرزو کی جائے پیدائش آگرہ ہی کو قرار دیا جائے۔ بہرحال آرزو کی پیدائش اکبرآباد میں ہو یا گوالیار میں، ان کی پرورش گوالیار میں ضرور ہوئی ہے۔ اس لیے کہ وہ گوالیاری زبان کو مستند مانتے ہیں اور اس کو دوسری زبانوں پر ترجیح دیتے ہیں

آرزو کی تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں بھی کافی اختلاف رائے ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے جبکہ دوسروں کا خیال ہے کہ وہ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ خوشگو، نے واضح طور پر تاریخ پیدائش ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء بتائی ہے اور یہ تاریخ آرزو کے والد محترم کے ایک قطعہ تاریخ

۱۔ اسپرنگر ص ۱۵۳ (۲) برلن کیٹلاگ ص ۷۴۵

"نزول غیب" سے نکالی گئی ہے (یعنی ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء) اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خوشگو کے پاس بھی آرزو کا بھیجا ہوا سوانحی خاکہ موجود تھا۔ جبکہ آزاد بلگرامی اپنی تصنیف سروِ آزاد میں لکھتے ہیں:۔

"ولادت شیخ سراج الدین در منتہای مائتہ حادی عشر واقع شدہ است"[1]

(شیخ سراج الدین کی پیدائش گیارھویں صدی کے آخر میں ہوئی) لفظِ منتہای مائتہ حادی عشر (گیارھویں صدی کا اواخر) سوائے ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جسے یقیناً گیارھویں صدی ہجری کا آخر کہا جا سکتا ہے۔ آزاد نے بھی خوشگو کے اس بیان (تاریخ پیدائش ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء کی تائید کی ہے۔ اگرچہ آزاد نے اپنے تذکرہ خزانۂ عامرہ جو کہ اپنے پہلے تذکرہ سروِ آزاد سے تقریباً دس سال بعد ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں مکمل کر رہے تھے آرزو کی تاریخ پیدائش ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء بتائی ہے۔ یہ یقیناً تاریخی اشتباہ ہے۔ اس لیے ہم نے آرزو کی تاریخ پیدائش ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء ہی صحیح مانی ہے۔ آرزو کی تاریخ پیدائش کے متعلق اتنے اشتباہ تھے کہ بعد کے علماء اس کی تاریخ پیدائش کا کوئی قطعی تعین نہ کر سکے۔ مثلاً اسپرنگر نے ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء اشپرنگر شوری نے ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء اور ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء دونوں ہی کو آرزو کی تاریخ پیدائش بتایا ہے۔ جدید علما نے قدیم ماخذوں سے استفادہ نہ کیا اور اکثر نے آرزو کی تاریخ پیدائش ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء ہی بتائی

۱۔ سروِ آزاد ص ۲۲۰

ہے۔ 'عقد ثریا' میں بھی ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء ہی تاریخ پیدائش بتائی گئی ہے۔ لیکن تمام بیانوں کی روشنی سے یہ پتا چلتا ہے کہ آرزو کا سال پیدائش ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۷ء ہی ہے۔

آرزو کے والد کا نام حسام الدین تھا۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر (م: ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کے عہد میں سپاہی پیشہ تھے اور سرکاری منصب داروں میں شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ یہ حسام اور حسامی دونوں تخلص سے شاعری کیا کرتے تھے آرزو نے اپنے والد کے کچھ اشعار مجمع النفایس میں نمونے کے طور پر نقل کیے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

گہی چین برجبین گاہی تبسم کردہ می آئی۔ بہر رنگی کہ خواہی جلوہ کن محو تماشائی

باہنگی عجب بردست مطرب زادۂ ہوشم

کہ از حیرت سراپا ہمچو نی گہ چشم وگہ گوشم

در بیابان ژالہ کار سنگ طفلاں می کند

در ازل شد قسمت دیوانہ از ہر باب سنگ

اس کے علاوہ 'مردم دیدہ'[۱] میں بھی کچھ اشعار نمونے کے طور پر ملتے ہیں۔

آرزو نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م: ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء) کے بھانجے شیخ کمال الدین سے ملتا ہے۔ آرزو کے والد شاعری سے

ہت دلچسپی رکھتے تھے۔ سفینہ خوشگو میں لکھا ہے کہ شاہی فوج سے
بستبردار ہونے کے بعد یہ گوالیار میں ٹھہرے اور آرزو کو فارسی
شعار زبانی یاد کرائے۔ اور یہ دو بارہ بیان کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی
یک رات میں آرزو سو سے دو سو تک فارسی کے اچھے اشعار یاد
رلیا کرتے تھے۔ عبدالمقتدر نے سفینہ خوشگو کے حوالے سے حسام الدین
کے انتقال کی تاریخ ۱۱۱۵ھ / ۰۴-۱۷۰۳ء بتائی ہے، جب آرزو تقریباً
۱۶ سال کے تھے۔

ماں کی طرف سے آرزو کا سلسلۂ نسب مشہور شیخ محمد
غوث شطاری گوالیاری (م: ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) سے ملتا ہے
جو خواجہ فریدالدین عطار نیشاپوری (م: ۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ء) کے
خاندان سے تھے۔ آرزو کے قول کے مطابق ان کی ماں کے خاندان
والے اسی وجہ سے عطاری کہلاتے تھے اور اسی لیے انہوں نے
یہ شعر کہا۔

جداست مرا حضرت عطار ازیں راہ
اشعار خود اکنوں بہ نیشاپور فرستم

(یعنی میرے جدامجد حضرت عطار ہیں اسی لیے میں نے اپنے اشعار
نیشاپور میں بھیج دیے۔

ان کی ماں کا خاندان گوالیار میں رہتا تھا اسی وجہ سے
آرزو نے اپنی ابتدائی زندگی کے سنہرے دن وہاں گزارے۔ فارسی
تذکروں میں ان کی نسبت گوالیاری بتائی ہے اسی وجہ سے وہ گوالیار

---

(۱) مجمع النفائس، مردم دیدہ ۴۰، عقد ثریا ص ۷، سرو آزاد ص ۲۲۷

کی بولی کو مستند مانتے ہیں۔

آرزو نے اپنی فارسی اور عربی تعلیم کی ابتدا تقریباً چودہ سال کی عمر (حدود ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء) سے کی اور وہ اپنے ہم جماعتوں میں نہایت ذہین شمار کیے جاتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" بندہ عصیان شعار بفضل حق امیدوار سراج الدین علی آرزو تخلص از و بدو شعور بہ تحصیل علوم اشتغال داشتہ تا چہاردہ سالگی داخل جرگۂ طلبۂ علوم بود"

اور بہت جلد بڑے عالم بن گئے۔ انھوں نے ہندی اور موسیقی میں بھی دستگاہ کامل حاصل کی۔ ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو سنسکرت میں بھی خاصی مہارت تھی۔ غرض یہ کہ کم سنی ہی میں علوم متداولہ میں دستگاہ پیدا کرلی۔ شعر گوئی کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں بڑی پختگی پیدا کرلی اور بالآخر شاعری کے علاوہ دوسرے فنون میں انہوں نے جو مہارت حاصل کی وہ کسی ایک سخنور کے حصہ میں نہیں آئی ہے بقول خوشگو چودہ سال کی عمر میں جب آرزو متھرا میں تھے انہوں نے فارسی میں شعر کہا اور جب چند سال بعد وہاں سے گوالیار واپس آئے تو میر عبدالصمد سخن کے شاگرد ہوئے لیکن آرزو بہت زیادہ دن تک سخن کی صحبت سے فیضیاب نہ ہوسکے کیونکہ سخن گوالیار چھوڑ کر آگرہ چلے گئے اس کے بعد آرزو نے میر غلام علی احسن[1] سے اپنے اشعار میں اصلاح لینی شروع کی۔

---

(۱) مجمع النفائس و گل رعنا از لچھمی نرائن شفیق۔

خان آرزو کی علمی فضیلت اور درجہ کمال ان کے اپنے زور بازو کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن ہی میں (۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء) ان کے والد شیخ حسام الدین حسامی کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ نے گوالیار میں سکونت اختیار کر لی اور کوئی عزیز و بیگانہ ایسا نہ تھا جو ان کی تعلیم و تربیت کرتا، نہ ہی کوئی غریب ماں کا معاون و خبرگیر رہا۔ خان آرزو نے ان تلخ حالات اور غم دوراں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور سونے کی طرح وقت کی بے رحم بھٹی میں تپ کر کندن بنے۔ ان کی ابتدائی تربیت کی تفصیل تو ہمارے سامنے نہیں لیکن چشم تصور سے اُن مشکلات اور مصائب کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ایک بے یار و مددگار بیوہ ماں کا بے یار و مددگار بیٹا کن کن ہفت خوانوں اور دشوار گذار مرحلوں سے گذر کر اس قابل بنا ہو گا کہ اپنے دور میں اہل علم معاصرین کے روبرو امام المتاخرین کہا جا سکے، دربار محمد شاہ کا ملک الشعرا بنایا جائے اور آج تک علمی طبقوں میں احتراماً خان آرزو لکھا جاتا ہو۔

شعر کی طرف خان آرزو کی رغبت سن شعور سے پہلے ہی پیدا ہو گئی جو والد کی موت کے بعد بھی قائم رہی۔ اس کے بعد تذکرے یہ کہکر خاموش ہو جاتے ہیں کہ خان آرزو کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی باپ کی قبل از وقت موت نے گھر برباد کر دیا، عسرت اور تنگدستی کے بادل امنڈ آئے مگر ہوشیار لڑکے کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی وہ تمام مصیبتوں کے باوجود گوالیار ہی میں مقیم رہے۔ ماں کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے مجمع النفائس میں جہاں اپنا ذکر کیا ہے وہاں اپنی ہر نقل و حرکت کو ماں ہی کے حکم کی تعمیل بتایا ہے۔ یوں ہی زمانہ گذرتا

رہا۔ غربت اور مصیبت کی گود کا پلا ہوا سپاہی علوم کی تحصیل اور گھر کی بگڑتی ہوئی حالت کو سنبھالنے میں پندرہ[۱۵] سولہ[۱۶] برس (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) کے سن تک استقلال سے کام لیتا رہا خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ آرزو جب سترہ[۱۷] یا اٹھارہ[۱۸] سال کے ہوئے تو فوج میں ملازمت کرلی اور دکن میں اورنگ زیب کی شاہی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ لیکن بقول آرزو جیسے ہی وہ دکن پہونچے (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) اورنگ زیب اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے اور آرزو شہزادہ محمد اعظم کی شاہی فوج کے ساتھ نو ماہ بعد ہی گوالیار واپس لوٹ آئے اور آگرہ کی طرف کوچ کیا تاکہ محمد اعظم اپنے بڑے بھائی محمد معظم سے مقابلہ کرسکے کیونکہ محمد معظم بھی تختِ شاہی کے وارثین میں سے تھے۔ آرزو کچھ دن گوالیار میں ٹھہرے پھر وہ اکبرآباد چلے گئے جہاں بقول خوشگو وہ پانچ سال مقیم رہ کر کسبِ علم اور کتبِ متداولہ کا مطالعہ کرتے رہے[۱] اس زمانے میں ان کے استاد مولانا عماد الدین مشہور بہ درویش محمد تھے۔ اسی دوران آرزو کو شاہ گلشن، مرزا حاتم بیگ، میاں عظمت اللہ کابل، محمد مقیم آزاد، میاں عظیم بن میاں نصیر علی اور دوسرے بزرگوں کی صحبت حاصل ہوئی جس نے ان کی شاعری کو فروغ دینے میں کافی مدد کی۔ چوبیس برس کی عمر میں علوم کی تکمیل کی اور ماں کے بلانے پر وہ اکبرآباد سے گوالیار واپس آگئے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کی جنگ کے خاتمہ پر بہادر شاہ تخت نشین ہوئے اور ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں بہادر شاہ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا جہاں شاہ تخت کا وارث ہوا۔ اسی درمیان

---

(۱) سرو آزاد ص ۲۲۷

اکبرآباد میں کسی عہدے پر فائز ہوئے اس کی وجہ سے وہ گوالیار کو چھوڑ کر آگرہ آ گئے۔ جہاں شاہ کو فرخ سیر نے شکست فاش دی اور فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے عہد حکومت میں شاید آگرے میں کسی عہدے پر فائز کیے گئے لیکن بقول خوشگو وہ دہلی میں فرخ سیر کے دربار سے وابستہ رہا لیکن بہت جلد ہی ان کو کسی عہدے پر گوالیار بھیج دیا گیا خوشگو کا یہ بھی کہنا ہے کہ آرزو نے چھ سال گوالیار اپنے وطن میں گزارے یہاں پھر آرزو نے اپنی شاعری کی طرف توجہ کی۔ آرزو ابھی گوالیار ہی میں تھے کہ ان کو دو سادات بھائی امیر الامرا حسین علی اور عبداللہ قطب الملک کے ہاتھوں سلطان فرخ سیر کے قید ہو جانے کی خبر ملی۔ یہ واقعہ ۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء کو رونما ہوا۔ بیدل نے قطعہ تاریخ لکھی ہے

سادات بوی نمک حرامی کردند = ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء

اسی سیاسی انتشار کے دوران اپنی ملازمت سے برخاست کر دیے گئے۔ چند روز بے کار رہ کر وہ اکبرآباد پہونچے۔ اسی سیاسی خلفشار نے آرزو کی علمی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ آگرہ اور دلّی میں فرخ سیر کے انتقال سے لے کر عبداللہ قطب الملک کے گرفتار ہونے تک (۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء) جو سیاسی بحران آیا۔ ان کا ذکر کرنا خالی از علّت نہ ہو گا۔

دو سید بھائی حسین علی خاں امیر الامراء اور سید عبداللہ قطب الملک فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں ہی بہت زیادہ قدرت مند ہو گئے تھے حکومت کی پوری کی پوری مشینری حتیٰ کہ قلعۂ معلیٰ کا انتظام بھی ان ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ لوگ ہی سب کام انجام

ہ تیے تھے انجام کار انہوں نے فرخ سیر کو ۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء کو معزول کرکے قید خانے میں ڈال دیا اور رفیع الدرجات شاہ عالم کے پوتے کو بادشاہ بنا دیا لیکن وہ تپ دق کا مریض تھا اور تخت نشینی کے تین ماہ کے اندر ہی رجب ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بڑا بھائی رفیع الدولہ شاہ جہان ثانی کے نام سے تخت پر بیٹھا، سادات بھائیوں کی بدقسمتی تھی کہ یہ نوجوان شہزادہ بھی تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ " بادشاہ بنانے والوں " کے لیے اچھا نہ تھا کیونکہ آگرہ میں ان کے کچھ مخالفوں نے اورنگ زیب کے پوتے نیکوسیر کو اکبر آباد کے قلعہ سے آزاد کرکے تخت پر بٹھا دیا۔ اس خبر نے سادات بھائیوں کو دھلا کر رکھ دیا اور وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ آگرہ پر حملہ آور ہوئے۔ تقریباً تین ماہ کی انتھک کوششوں کے بعد قلعہ کو فتح کر لیا اور نیکوسیر کو تخت سے ہٹا کر شاہ جہان ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اس پورے واقعہ کو میر عبد الجلیل بلگرامی نے اپنے قصیدے میں نہایت بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے اور آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں حواشی اور تعلیقات کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ اگر یہاں اس قصیدے کے چند اشعار نقل کر دیے جائیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مژدہ اے دوستاں کہ در عالم	نقد شد نسیۂ بہار ارم
نونہال طرب ببار آمد	گل فشاں گشت خاطر خرم
دل خوشی نشۂ رسا بخشید	بہ گل و سبزہ و بہار قسم
من ہم از باغ معنیِ رنگین	گل چندی زدم بہ فرق قلم
ورقِ ما بیاضِ سینۂ حور	سطرہا سلک گوہر نیلم

گر بپرسی ز جامعیت من | میر خسرو دہد جواب نعم
کرد عبد الجلیل در تاریخ | "قلعۂ آگرہ گرفت" رقم
بر دعا بہتر است ختم سخن | کہ بہ آمین کند ملک معلم
چار چیزش نشاط افزا باش | تا بود سبزہ در چمن خرم
دست زر پاش تیغ اعدا کش | عمر ممدود و لبِ اُدوم

شاہ جہاں ثانی کی وفات کے بعد (۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء) جہاں شاہ کے بیٹے روشن اختر ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء محمد شاہ کے لقب سے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ کچھ دنوں تک سادات بھائیوں کے ساتھ حالات بہتر رہے لیکن ایک سال کے بعد مخالف امرا نے سادات بھائیوں کے ساتھ دغا بازی کی جس کے نتیجے میں امیر الامرا حسین علی خاں ۷ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء کو فتح پور سیکری کے قریب میر حیدر کاشغر کے ہاتھوں اعتماد الدولہ محمد امین خان کی تحریک پر قتل کر دیے گئے میر عبد الجلیل بلگرامی نے جو کہ حسین علی خان کے عزیز دوستوں میں تھے ان کی موت پر ایک مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

آثار کربلاست عیاں از جبین ہند | زد جوش خون آل نبی از زمین ہند
شد ماتم حسین علی تازہ در جہان | سادات گشتہ اند عیبت نشین ہند
گیتی چرا سیاہ نہ گردد ز دودِ غم | خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند این چنین مصیبتِ عظمیٰ نہ دیدہ است | دیدیم داستانِ شہور و سنینِ ہند
ماہی در آب می طپید و مرغ در ہوا | از شیون عظیم امیر مہین ہند
رستم نشان حسین علی خان شہید شد | از خنجری کہ بود نہان در کمین ہند
ہند از شہادتش تن بی روح گشتہ است | یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند

عالم چوں قیر در نظر خلق شد سیاہ | افتاد تا ز خاتم زہرا زو انگبین ہند
از دستِ ابن ملجم ثانی شہید شد | این چند بیت ز تخت جو در ثمین ہند
سالِ شہادتش قلم واسطی نوشت | قتلِ حسین کرد یزید لعین ہند

۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء

حسین علی کے قتل کے بعد سید عبد اللہ نے اپنی پرانی حیثیت قائم رکھی۔ اس نے سلطان ابراہیم بن رفیع الشان بن شاہ عالم کو دہلی کے تخت پر بٹھایا اور پھر شاہی فوج کی طرف متوجہ ہوا سلطان ابراہیم کے حامیوں اور شاہی افواج کے درمیان ۱۳ محرم ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء

کو حسن پور میں ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں سلطان ابراہیم کو شکست ہوئی اور اس کے سب سے بڑے حامی قطب الملک کو قید خانے میں ڈال دیا

گیا جہاں بالآخر اس کو زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ اور اس طرح ان دو سادات بھائیوں کا آفتاب عروج غروب ہو گیا۔ سلطنت کی تباہی، خانہ جنگی اور طوائف الملوکی نے دنیا کی بے ثباتی اور جاہ و ثروت کے فریب کو آرزو کی نظروں میں بالکل عریاں کر دیا۔ اس ماحول نے ان کو اور زیادہ مستقل مزاج، متحمل، بردبار اور متواضع و متوکل بنا دیا۔ مرزا محمد افضل سرخوش، بیدل، میر عبد الجلیل بلگرامی اور ناصر علی سرہندی کی نغمہ سرائیوں اور ان کے اخلاقی محاسن نے ان کے مذاق سلیم کو جلا دے کر انتہائی سنجیدہ، حلیم، مہذب، شائستہ اور خلیق بنا دیا اور اپنی عمر کے چوبیسویں یا پچیسویں سال میں ہی وہ لوگوں کے معتمد علیہ بن گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ خان آرزو فرخ سیر کی معزولی کے بعد ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ مجمع النفائس میں ہے کہ جب حالات (غالباً ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء کے درمیان سید حسین علی خان سے آگرہ میں لڑائی کے بعد) بہتر ہو گئے تو خان آرزو اکبرآباد آئے اور وہاں مرزا جان کے توسط سے اچھے عہدے پر فائز ہوئے اور گوالیار میں سوانح نگار کی حیثیت سے مقرر ہوئے تو جلد ہی اکبرآباد سے گوالیار چلے گئے اور اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے میں منہمک ہو گئے حسین علی خان کے انتقال اور سید عبداللہ قطب الملک کی معزولی کے وقت تک تقریباً ایک سال وہ اپنی نوکری پر مامور رہے یعنی تقریباً محرم ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء تک وہ گوالیار میں اپنے عہدے پر فائز رہے اور نہایت تن دہی سے اپنا کام انجام دیتے رہے۔

آرزو نے تقریباً ۳۵ سال دہلی میں گزارے لیکن دہلی میں ان کے اس دورِ قیام کے بارے میں ہم کو بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ وہ گوالیار سے دہلی آئے ان کے دہلی پہنچنے کی تاریخ میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ آرزو دہلی ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں پہنچے۔ سی۔ اے۔ اسٹوری نے اپنی کتاب "پرشین لٹریچر"[1] میں اس تاریخ کا ذکر کیا ہے جبکہ کچھ جدید تذکرہ دوں مثلاً از نیر دانی وغیرہ نے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء کو ان کے دہلی میں وارد ہونے کا سال بنایا ہے۔ ایک دوسرا تذکرہ ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء ان کے دہلی میں وارد ہونے کا سال بتاتا ہے۔ لیکن میری نظر میں ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء

۱- پرشین لٹریچر ۱/۲ ص ۸۴۴ - ۸۴۰

اور ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتے، اس کی وجوہ یہ ہیں:

۱۔ آرزو اپنے سوانحی خاکے کے مطابق، جو انہوں نے خوشگو کو بھیجا تھا، دہلی میں تیس سال یعنی سنہ ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء مجمع النفایس کی تکمیل کے وقت تک رہے خوشگو کا یہ بیان آرزو کے سوانحی خاکے کے مطابق ہے اور وہ مجمع النفایس کے عین مطابق ہے اس لیے احتمال قوی یہ ہے کہ وہ خاکہ مجمع النفایس کے بیان پر ہی مبنی ہے اور وہ یقیناً مجمع النفایس کی تکمیل ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء کے بعد ہی خوشگو کو بھیجا گیا تھا۔ ان تمام بیانوں کے مطابق آرزو یقیناً ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء کے بعد اور ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱ء سے پہلے دہلی پہنچے ہوں گے

۲۔ مجمع النفایس میں صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ آرزو امیر الامرا حسین علی خان کے قتل اور ان کے بھائی سید عبداللہ قطب الملک کے معزول ہو جانے کے بعد دہلی پہنچے۔ بقول آرزو:۔

" بعد از آنکہ سید حسین علی خاں امیر الامرا بدست یکی از مغلیہ نواب محمد امین خاں کشتہ شد و سید عبداللہ قطب الملک وزیر اعظم جنگ کردہ بگیر در آمد و بادشاہ مبرور و مغفور محمد شاہ کہ درایں ایام ملقب بفردوس آرام گاہ است داخل مستقر دولت و خلافت گردید۔ ایں عاجز درہمان سال از گوالیار باز بدہلی آمد"

جیساکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ امیر الامرا ۶ ذی قعدہ ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء کو قتل کر دیے گئے اور سید عبداللہ قطب الملک ۱۳ محرم ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء کو معزول کیے گئے، اس سے واضح ہے کہ خان آرزو ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء میں دہلی آ گئے۔

ایک قابل تحقیق امر یہ ہے کہ آرزو دہلی میں کتنی مدت تک رہے۔ انہوں نے خود اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وہ تقریباً تینتیس سال تک دہلی میں مقیم رہے لیکن حالات ان کے قول کی تصدیق نہیں کرتے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں دہلی آئے آرزو نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ وہ موتمن الدولہ اسحٰق خاں شوشتری کے ساتھ "بیست و چند سال" تک منسلک رہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں دہلی آئے کیونکہ موتمن الدولہ کا انتقال ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء میں ہو گیا۔ آرزو یقیناً ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء یا ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء سے ہی ان کے ساتھ رہے ہوں گے۔

لیکن یہ تمام باتیں آرزو کے اپنے بیان سے کہ وہ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء میں محمد شاہ کی تاجپوشی۔ اور ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء میں امیر الامرا کے انتقال اور ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء میں قطب الملک کی معزولی کے وقت دہلی آئے، بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے میرے خیال کے مطابق صحیح لفظ "سی" ہے نہ کہ "سی و سہ" جیسا کہ سفینۂ خوشگو میں مذکور ہے۔ ایک اور نکتہ کہ آرزو دہلی میں تیس سال مجمع النفایس کی تکمیل کے وقت تک ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء مقیم رہے قابل توجہ ہے۔ یہی سال خزانۂ عامرہ (۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء) میں[1] آنند رام مخلص کے ترجمے کے ذیل میں درج ہوا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مجمع النفایس کا وہ مخطوطہ جو رامپور میں موجود ہے

---

(۱) خزانۂ عامرہ ص ۱۲۵

اس میں کچھ غلطیاں ہیں کیونکہ اس میں آرزو کے دہلی میں قیام کے سلسلے میں بجائے "شتی" کے "سی و سہ" درج ہوا ہے

دہلی کے علم دوست حضرات نے آرزو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں ان کی ملاقات آنند رام مخلص (م: ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) سے ہوئی۔ آرزو نے مجمع النفائس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے قیام دہلی کے دوران مخلص ان پر بہت زیادہ مہربان رہے۔ بقول آرزو:-

"باعث بودن فقیر در شاہ جہان آباد دہلی اخلاص اوست از مدت سی سال تا الیوم سر رشتہ محبت و مودت را از دست نداده"[1]

مخلص خود شاعر تھے اور آرزو سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ رشتہ دہلی آنے کے بعد ہی قائم ہوا ہو۔ بہرحال مخلص اعتماد الدولہ قمر الدین اور سیف الدولہ عبد الصمد خان گورنر لاہور و ملتان کے وکیل تھے ان کو دربار میں رسائی[2] حاصل تھی۔ ان کی کوشش سے آرزو بادشاہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ یہ زمانہ آرزو کے لیے مالی اطمینان کا تھا بقول [illegible] ہفت صدی کا منصب اور جاگیر کا اعزاز [illegible] حاصل ہوگیا۔ دربار شاہی سے وابستگی نے [illegible] اور ان کی ذکاوت اور ذہانت نے بزرگوں [illegible] متوجہ کر دیا اس طرح جلوس محمد شاہی [illegible] بہترین عناصر جذب کرنے کے لیے استعداد

(۱) خزانۂ عامرہ ص ۲۲۵
(۲) [illegible] ص ۱۱۰ [illegible] سی اے اسٹوری ص ا پرشین لٹریچر

بہم پہنچائی تھی۔ آرزو کو محمد شاہ کے خانساماں موتمن الدولہ[1] اسحٰق خان شوشتری کی بھی حمایت و سرپرستی حاصل تھی۔ ان سے آرزو کے بیس سال مراسم تھے۔ یہ عربی و فارسی نظم و نثر میں مہارت رکھتے تھے آرزو کو ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں دکنی مہمات کی وجہ سے اپنے سرپرست کی معیّت میں دکن کی طرف جانا پڑا۔ واپسی پر آرزو نے دہلی کی فصیل کے باہر بستی وکیل پورہ میں جہاں مخلص کی حویلی تھی اپنا مکان بنالیا ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء میں شوشتری کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ کی آرزو پر خاص نظر عنایت رہی۔ انہوں نے باپ کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی آرزو کو ۱۵۰ روپیہ ماہانہ دینے لگے۔ اس کے علاوہ دیگر مراعات بھی انہیں بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ مجمع النفائس میں درج ہے کہ آرزو نجم الدولہ کے ساتھ چودہ (۱۴) سال تک رہے، شاید انہوں نے یہ بات ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء سے پہلے لکھی ہوگی کیونکہ ان کا انتقال آرزو کے تذکرے مجمع النفائس کی تکمیل (۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء) سے پہلے ہو چکا تھا اور مصنف نے اس کتاب میں ان کے لیے دعائیہ کلمات استعمال کیے ہیں چنانچہ یہ قبول کرنا مشکل ہے کہ وہ نجم الدولہ کے ساتھ چودہ (۱۴) سال تک منسلک رہے کیونکہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اسحٰق خان کا انتقال ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں اور نجم الدولہ کا ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں ہوا اور دونوں کے درمیان کا وقفہ گیارہ سال ہی نکلتا ہے مختصر یہ کہ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ ہم مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں۔

---

(۱) مآثر الامرا ۳: ۷۶۶۔

۱۔ یا تو نجم الدولہ کے ساتھ رہنے کا چودہ سال کا زمانہ غلط ہے
۲۔ یا آرزو نے ان کے والد اسحٰق خان کے ساتھ کا چار سال کا زمانہ بھی اس میں ہی جوڑ لیا۔ اور اس طرح نجم الدولہ کے ساتھ رہنے کا زمانہ چودہ سال شمار کر لیا۔

نجم الدولہ کے ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سالار جنگ نے آرزو کی سرپرستی کرنی شروع کی اور وہ کچھ دنوں بعد اودھ کے سفر پر روانہ ہوئے آرزو دہلی میں ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۳ء تک رہے جیسا کہ سروِ آزاد میں آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ آرزو نے دہلی کو اس وقت خیر آباد کہا جب وہ سروِ آزاد کی تکمیل (۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۳ء) کر چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا درست ہوگا کہ آرزو سالار جنگ کے ساتھ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء کے اوائل میں اودھ کے سفر پر روانہ ہوئے ہوں گے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سالار جنگ نے اودھ جانے کا فیصلہ کیا اور آرزو نے وہاں تک ان کی ہمراہی کی کیونکہ نادر شاہ کے حملے نے دہلی کو تاراج کر دیا تھا۔ پورا شہر ویرانی اور بے اطمینانی کی آماجگاہ بن گیا، اس وقت آرزو شوشتری کے رہین کرم ہو چکے تھے لیکن یہ خاندان بھی دہلی کی تباہ کاریوں سے گھبرا چکا تھا۔ سالار جنگ کے سفرِ اودھ کی وجہ اودھ اور الہ آباد کے فرمانروا نواب وزیر صفدر جنگ سے ان کی رشتہ داری تھی مآثر الامرا میں مذکور ہے کہ شجاع الدولہ بن صفدر جنگ کی شادی سالار جنگ کی بہن اور نواب اسحٰق خاں کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم

سے ہوئی تھی۔ آرزو کی تاریخ سفر اودھ کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ آزاد سروِ آزاد میں لکھتے ہیں :-

"بعد اتمام سرو آزاد، سراج الدین علی خاں آرزو شاہ جہاں آباد برخاستہ رخت سفر بہ دیار شرقی کشید، و در بلدہ لکھنؤ آمد و بوساطت سالار جنگ پسر اسحاق خان با نواب صفدر جنگ ناظم صوبہ اودھ برخورد و بعواطف اختصاص یافت وچوں نواب صفدر جنگ در ہفدہم ذی الحجۃ سنہ سبع وستین و مائۃ والف (۱۱۶۷ھ) درگذشت آرزو با شجاع الدولہ خلف مذکور کہ قائم مقام پدر شد بسری برد"[1]

یہ بات واضح ہے کہ آرزو نواب صفدر جنگ سے سالار جنگ بن اسحٰق خاں کے توسط سے متعارف ہوئے تھے۔ خزانۂ عامرہ کے مطابق آرزو محرم ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ۱۷ ذی القعدہ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء کو اودھ پہنچے:

"بعد انتقال نجم الدولہ با سالار جنگ برادر خورد نجم الدولہ صحبت بر آرشد و ہمراہ او از دہلی قصد دیار شرقی کرد و در اواخر محرم سنہ ثمان وستین و مائۃ والف بعد ایام معدودا از وفات صفدر جنگ ناظم صوبۂ اودھ و صوبہ الہ آباد کہ ہفدہم ذی الحجۃ سنہ سبع وستین و مائۃ والف درگذشت بہ بلدہ اودھ کہ وطن اصلی جلد او شیخ کمال الدین ست، رسید"[2]

---

(۱) سرو آزاد ص ۲۳۰ - ۲۳۱ (۲) سرو آزاد ص ۱۱۸

خزانۂ عامرہ کے مطابق اودھ آرزو کے اجداد کا اصلی وطن تھا جن کا سلسلۂ نسب شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے ملتا ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ چراغ دہلی اودھ کے رہنے والے تھے اسی بنا پران کو اودھی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے خزانۂ عامرہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کے درست ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے یہی وجہ ہوگی کہ آرزو اودھ کے سفر کے لیے تیار ہو گئے ہوں گے

خان آرزو تقریباً دو سال تک نواب شجاع الدولہ کی صحبت سے فیضیاب ہوسکے تھے کہ رہیں وہ ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آزاد بلگرامی نے ان کی وفات پر دو قطعے کہے ہیں، سروِ آزاد میں وہ لکھتے ہیں :-

"در جمادی الآخر سنہ تسع وستین ومائۃ والف (۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء) در بلدۂ لکھنؤ فوت کرد و در ہمیں شہر مدفون گردید، مولف کتاب گوید :-

سراج الدین علی خاں نادر عصر | زمرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسی سال وفاتش | "بگو آں جان معنی آرزو رفت"[1]

سنہ ۱۱۶۹ھ/ سنہ ۱۷۵۶ء

خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں :-

"وسوم ربیع الآخر سنہ تسع وستین ومائتے الف بجوار رحمت حق پیوستہ اول اورا در لکھنؤ امانت گذاشتہ وبعد چندگاہ بقیہ جسد اورا شاہ جہاں آباد بردہ دفن کردند، مولف گوید :-

(۱) سروِ آزاد ص ۲۳۱

خانِ والا شان سراج الدین علی . شمعِ رونق بخش بزم گفتگو
زد رقم آزاد سال رحلتش "رحمت کامل بروح آرزو"(۱)
۱۱۶۹ھ / ۱۷۶۵ء

خان آرزو کے ساتھ اودھ کے دورانِ قیام ایک واقعہ پیش آیا۔ خزانۂ عامرہ میں اس واقعہ کا ذکر جس کا ترجمہ یہ ہے اس طرح ہے :-

میرے خالہ زاد بھائی محمد یوسف جن کے کہنے پر یہ کتاب تکمیل کو پہنچی مجھ کو لکھتے ہیں کہ انہوں نے تین بار اودھ میں آرزو سے ملاقات کی۔ اس وقت وہ اپنی شعری تصنیف میں مشغول تھے اور ردیف دال تک اس کو مکمل کر چکے تھے۔ محمد یوسف آرزو سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ایک بار محمد یوسف نے باوجود آرزو کے منع کرنے کے اپنے گھر مدعو کیا۔ میر عبدالجلیل بلگرامی کے دوست ہونے کی وجہ سے میر محمد یوسف نے آرزو کو دہلی میں دیکھا تھا اور جب آرزو نے ان کو غیر معمولی آدمی سمجھا تو ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا"(۲)

مخزن الغرائب میں احمد علی سندیلوی نے لکھا ہے کہ جب آرزو لکھنؤ میں ان کے والد سے ملاقات کے لیے آئے تو ان کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک قطعہ دیا لیکن چونکہ وہ اس زمانے میں بہت چھوٹے تھے

---

(۱) خزانۂ عامرہ ص ۱۱۹
(۲) ایضاً

اس لیئے اس قطعہ سے استفادہ نہ کرکے مندرجہ بالا باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرزو نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی، اس بات کی تصدیق مصحفی کے تذکرے "عقد ثریا" میں اس بیان سے ہوجاتی ہے :-

"در ایامیکہ بعد فوت موتمن الدولہ اسحاق خان شوشتری و پسرش نجم الدولہ کہ قدردان و معونت رسان او بودند باسالار جنگ برادر خورد نجم الدولہ باش اتفاق افتاد ہمراہ او از شاہ جہان آباد بار سفر بربست وخود را بہ شہر اودہ کہ وطن اصلی بزرگانش بود انداخت، و بعد توقف چندی بوساطت نواب سالار جنگ بہادر بملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ بدر ماہہ سہ صد روپیہ عزوا متیاز یافت .... الحاصل رحلتش در یک ہزار و یک صد و شصت و نہ واقع شد ...... جسدش در لکھنؤ امانت گذاشتہ بودند۔ بعد انقضای ایام موعود شاہ جہان آباد بردند و بخاک سپردند"۔ (۱)

ابو اللیث صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ لکھنؤ اس وقت قصبہ تھا وہاں آرزو کیوں جانے لگے، لکھنؤ تو آصف الدولہ کے زمانے میں کہیں جاکر مرکز سلطنت بنتا ہے لیکن اگر انھوں

---

(۱) عقد ثریا ص ۱۳

نے تاریخ فرح بخش کو بھی دیکھا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شجاع الدولہ نے بھی ایک زمانے میں عارضی طور پر لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ فرح بخش میں یہ اطلاع دی گئی ہے :-

"نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد فیض آباد میں سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے لکھنؤ کو اپنی مستقل رہائش کے لئے منتخب کیا۔ وہ چونکہ ہر سال سفر پر جاتے تھے اس لیے وہ ایک یا دو راتیں فیض آباد میں گزارتے پھر گورکھپور اور بنارس کا رخ کرتے، یہاں تک انہوں نے ۱۱۷۸ھ میں انگریز فوج کو ملازم رکھا اور ۱۱۷۹ھ میں فیض آباد ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا"

ابواللیث صدیقی نے اپنی کتاب "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں لکھا ہے کہ آرزو نے فیض آباد میں وفات پائی، وہ کہتے ہیں :-

"اور اس کے بعد ہی جب دلی کی ویرانی سے گھبرا گئے تو فیض آباد چلے آئے۔ رام بابو سکسینہ نے ان کا لکھنؤ آنا لکھا ہے۔ لیکن شجاع الدولہ اس وقت تک فیض آباد میں رہتے تھے . . . . میر حسن کے والد میر ضاحک اور خود میر حسن بھی نواب سالار جنگ کے وابستگان دولت میں تھے اور ان بزرگوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت فیض آباد ہی میں تھے . . . یہ تسلیم کرنے میں شبہ ہے کہ آرزو لکھنؤ بھی گئے ہوں گے . . ."

آرزو نے عمر کا باقی حصہ فیض آباد ہی میں گذارا اور وہیں ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی لیکن لاش دفن ہونے کے لیے دہلی لائی گئی۔"(۱)

راز یزدانی کا بھی یہی خیال ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"اس جگہ تذکرہ نگاروں کی ایک عام غلطی کی طرف اشارہ کردینا چاہیئے کہ اودھ کے ہر آنے والے کے لئے یہی لکھا جاتا ہے کہ وہ دہلی سے چلا تو لکھنؤ پہنچا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں لکھنو کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہ تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ بھی سات برس تک فیض آباد ہی میں رہے۔ ان کی روک ٹوک، بندشوں اور پابندیوں سے گھبرا کے فیض آباد سے نکلے اور لکھنؤ آ بیٹھے۔ آصف الدولہ کا ۱۱۸۱ھ کا واقعہ ہوسکتا ہے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں خان آرزو کا انتقال کرجانا یقینی ہے کیونکہ ان کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں بتایا جاتا ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہذا خان آرزو کا لکھنو کا بود و باش اختیار کرنا غلط ہے البتہ سالار جنگ کی ہمرکابی میں ان کا فیض آباد آنا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ سالار جنگ کی سفارش پر شجاع الدولہ نے ان کے تین سو روپے ماہوار مقرر کردیے لیکن وہ اس فراغت کی زندگی سے زیادہ بہرہ

(۱) نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۵۲ء

تمتع نہ کر سکے اور ۱۱۶۹ھ میں جان جان آفرین کے
سپرد کر دی۔ مرتے وقت خان آرزو نے وصیت کی تھی
کہ میری لاش دہلی لے جاکر دفنائی جائے چنانچہ فیض آباد
میں ایک معین مدت تک کے لیے سپرد خاک کیے گئے
اور وہ مدت گزر جانے کے بعد ان کی میت دہلی لاکر
دفنائی گئی (۱)

ابو اللیث اور راز یزدانی کے برخلاف کوثر چاند پوری نے
لکھا ہے کہ آرزو نے دہلی کو خیرآباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی
دوسرے معنوں میں کوثر چاند پوری کے قول کے مطابق آرزو کا فیض آباد
میں رہنا قطعی نہیں لیکن بلا شبہ یہ قول ابو اللیث اور یزدانی کے
قول کے برخلاف ہے۔

اب ہم خزانۂ عامرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے مصنف نے
صاف طور پر اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ آرزو لکھنؤ میں فوت ہوئے
کچھ دنوں تک وہیں دفن رہے اور بعد میں لاش وہاں سے نکال کر دہلی
لائی گئی اور یہاں وہ وکیل پورہ میں دفن ہوئے۔ وہ کہتے ہیں:

"اول اورا در لکھنؤ امانت گذاشتند و بعد چندگاہ
نقیہ جسد او را بہ شاہجہان آباد دفن کردند" (۲)

آرزو کے جسد خاکی کو لکھنؤ سے دہلی منتقل کرنے اور یہاں دفن
کرنے کے سلسلہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ آزاد بلگرامی نے

---

(۱) نقوش جنوری ۱۹۶۳ء

(۲) خزانۂ عامرہ ص ۱۱۹

سروِ آزاد میں کہیں بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ آرزو
پہلے لکھنؤ میں دفن ہوئے اور پھر وہاں سے ان کی لاش دہلی لائی گئی
اور یہاں دفن کیے گئے اس لئے ہم یہ آسانی سے قیاس کرسکتے ہیں
کہ یہ منتقلی ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء یعنی اس تاریخ کے کچھ دنوں بعد جس کی
طرف سروِ آزاد میں اشارہ کیا گیا ہے نہیں ہوئی۔ یہ تقریباً یقینی بات
ہے کہ آرزو کی لاش مرنے کے فوراً بعد ہی منتقل نہیں کی گئی بلکہ اس میں
کچھ ماہ لگ گئے ورنہ آزاد اپنے تذکرے میں اس حقیقت کا ذکر لازمی
طور پر کرتے کیونکہ انہوں نے آرزو کے انتقال کے متعلق جو اطلاعات بہم
پہنچائی ہیں وہ پوری طرح درست ہیں خزانۂ عامرہ میں لفظ "بقیہ جسد"
کا استعمال ہوا ہے۔ اس سے یقیناً یہ مراد ہے کہ آرزو کی لاش کی منتقلی کچھ دنوں
کے بعد ہی ہوئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آرزو کے جسدِ خاکی کی منتقلی ان کی اپنی
خواہش کی وجہ سے ہوئی تھی۔ منوہر سہائے انور نے واضح طور پر یہ کہا
ہے کہ آرزو آخر میں جمنا کے قریب اپنے گھر وکیل پورہ میں لاکر دفنائے گئے تھے۔

آرزو نہایت متواضع، شگفتہ مزاج، بردبار آدمی تھے۔ ان کا
عہدہ بھی بہت زیادہ سنجیدگی اور متانت کا طالب تھا لیکن انکی ظرافت
اور شگفتگی کے احساس کو دبا نہ سکا تھا اور نہ ان کے اندر خود پسندی
پیدا کر سکا۔ دوسرے شعرا کی طرح آرزو کا جمالیاتی حسن بھی زندہ
تھا اور وہ حسن پرستی کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک مشاعرے میں چند
شعر دوست حضرات بیٹھے شعر و سخن پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں
سے ایک صاحب نے آرزو کی بے حد تعریف کی دیوان سودا کے دیباچہ

نگار حکیم اصلح الدین خان کی رگ ظرافت پھڑکی اور ہنس کر فرمایا۔

آرزو خوب است اما این قدر ہا خوب نیست

آرزو کو اس سے کوئی آزردگی نہیں ہوئی بلکہ وہ اور لوگوں کے ساتھ ہنس پڑے۔

خان آرزو کے اُستاد، معاصر اور شاگرد

بقول خوشگو آرزو نے تقریباً چودہ سال کی عمر سے ہی شاعری کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ دو زبانوں فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے جب وہ چودہ سال کی عمر میں متھرا میں تھے انہوں نے اپنا سب سے پہلا شعر فارسی زبان میں کہا اور جب وہ ایک سال بعد وہاں سے گوالیار واپس آئے تو میر عبد الصمد سخن کے شاگرد ہوئے اور اپنے اشعار کی اصلاح ان سے لیا کرتے تھے لیکن زیادہ دنوں تک سخن کی صحبت سے فیضیاب نہ ہو سکے، سخن ایک دو ماہ بعد ہی گوالیار چھوڑ کر آگرہ چلے گئے، بقول آرزو:۔

"بعد ازاں بمقتضای شور جوانی و طغیان نادانی میلی بگفتن اشعار پیدا کرد بعد یک سال از آن از نظر میر صاحب سخن رحمتہ اللہ تعالیٰ افکار خود گذرانیدہ و یک دو ماہ برین گذشتہ بود کہ مفارقت بمیان آمد ناچار تنہای را استاد خود مقرر نمودہ بدرس خاموشی اشتغال داشت"[1]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

" فقیر آرزو در پانزدہ سالگی در عنفوان شعور جنون ہنگامہ ابو المفنون شعر خود را از نظر افادات اثر ایشان گذرانیدہ

(۱) مجمع النفائس، ص ۵۴۔

"بلکہ تا حال کہ در پنجاہ سالگی تخمیناً بر آن گذشتہ پارہ کاغذہای شعر را کہ اصلاح ایشان بر آن است پیش خود دارد یا بگران مایگی جنس خویش آنرا دیدہ خود را گم نکند"(۱)

اتفاقاً ایک روز میر غلام علی احسنی خود آرزو کے گھر آئے اور بغیر کسی غرض کے ان کی تربیت کرنی چاہی۔ اس وقت آرزو کی عمر سولہ سال تھی۔ انہوں نے اپنا یہ شعر غلام احسنی کو دکھایا:۔

تا دیدہ ام بزلف پریشان او گرہ   دارم چو گردباد نفس در گلو گرہ

اور یہ مطلع بھی ان کی نظر سے گزرا:۔

این حلقہ حلقہ زلف سیاہ تو دام کیست   این شوخ شوخ آہوی چشم تو رام کیست

خان آرزو ان کے متعلق مجمع النفایس میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"سید غلام علی میر: فقیر آرزو در ایام طفلی اشعار خود را در خدمت ایشان گذرانیدہ و برا این احقر حق بسیار ثابت نمودہ اند، این مرد بزرگوار از سادات صحیح النسب بود، اجدادش توطن گوالیار اختیار نمودہ۔ بالفعل دیوان ایشان پیش فقیر نیست۔ دو بیت کہ یاد بود نوشتہ میشود:

شانہ را آہستہ زن مشاطہ بر گیسوی او   رشتۂ جان من است ای بیخبر ہر موی او
احسنی یکسر بہنگام خرامش بشنوی   مانک آن خلخال پا نازم حیا نازم حیا

اس طرح آرزو کے اس بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میر غلام احسنی کا دیوان بھی ان کے پاس موجود تھا۔

---

(۱) مجمع النفایس ص ۵۲

آرزو مرزا افضل سرخوش، بیدل اور میر عبدالجلیل بلگرامی سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ وہ بیدل کے تصرفات کے بہت زیادہ قدردان تھے، حالانکہ ان حضرات کا بڑھاپا تھا اور خان آرزو کی جوانی اس کے باوجود وہ ان لوگوں کا نام نہایت عزت و احترام سے لیتے تھے۔ ان سے اپنی ملاقات اور اپنے استفادہ کے حالات بیان کیے ہیں۔ محمد افضل سرخوش کے ضمن میں ہے کہ ایک مرتبہ آرزو ان سے ملنے گئے۔ اس وقت سرخوش کی بصارت زائل ہو چکی تھی اس لیے انھوں نے اپنی بیاض اپنے بیٹے فضل اللہ کو شعر سنانے کے لیے دی۔ اس پر آرزو نے یہ پُرلطف بات کہی کہ بیٹے کو جو نورِ چشم کہتے ہیں اس کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ سرخوش نے بھی آرزو سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے اولاً پاسِ ادب سے عذر کیا لیکن اصرار کرنے پر ایک غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

افتادگیست مایۂ نشو و نمای من نخلم چو گرد باد ز خاک آب می خورد

سرخوش اسے سنکر بہت خوش ہوئے۔

آرزو کے معاصرین میں میر غلام علی آزاد بلگرامی، میر محمد افضل ثابت، سعد اللہ گلشن، علی قلی خاں، قزلباش خان اُمید، میر شمس الدین فقیر اور شیخ علی حزین وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کا نام وہ نہایت عزت و احترام سے لیتے ہیں ان سے عقیدت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور ان میں جو اوصاف ہیں انھیں واضح کرتے ہیں۔ آرزو کے معروف معاصرین کے مختصر حالات درج ذیل ہیں۔ معاصرین کے حالات اور ان کے کارناموں کے بارے میں اظہارِ خیال کا مقصد

ہے کہ اس دور کے ادبی ماحول کا ایک مختصر خاکہ ذہن نشین ہو جائے

میر غلام علی آزاد بلگرامی

میر غلام علی آزاد الحسینی الواسطی بلگرامی پنجم صفر بروز یکشنبہ ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۵ء کو صوبۂ اودھ کے قصبۂ بلگرام، محلہ میدان پورہ، میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب موتم الاشیال بن زید شہید بن امام بن زین العابدین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں؛

گرچہ باشد موتم الاشیال عیسی جدِ من
عیسی جان بخش شیرا مم بامداد نفس(۱)

اس ضمن میں ایک اور دلچسپ اطلاع، دیتے ہیں کہ:

مرا بہ تیغ ستم کشت از سرِ ناز چراغ دودۂ زید شہید روشن شد(۲)

آزاد نے پانچ استادوں سے کسب علم کیا۔ ان کے سب سے پہلے استاد طفیل محمد ہیں۔ انھوں نے آزاد کو درسی علوم کی تعلیم دی۔ دوسرے استاد میر عبدالجلیل ہیں جن سے انہوں نے لغت، حدیث، سیر نبوی اور فنون ادب سیکھے۔ تیسرے استاد سید میر محمد ہیں جنھوں نے ان کو عروض و قوافی اور بعض دوسرے فنون و ادب میں مہارت بہم پہنچائی۔ چوتھے استاد شیخ محمد حیات ہیں جنھوں نے آزاد کو مدینہ میں صحیح بخاری شریف پڑھائی اور پانچویں استاد شیخ عبدالوہاب طنطاوی ہیں، مکہ میں علم حدیث کے بعض فوائد

---

(۱) خزانہ عامرہ ص ۱۲۳

(۲) ایضاً

ان کے زبان مبارک سے سنکر آزاد کے دل پر نقش ہوئے اور ان
کے ہی توسط سے میر سید لطف اللہ بلگرامی کے ہاتھوں پر بیعت کی
رسم ادا ہوئی۔ آزاد نے اپنی زندگی میں تین اہم سفر کیے۔
پہلا سفر شاہ جہان آباد کا تھا جہاں وہ بلگرام سے بغرض ملازمت
تشریف لے گئے تھے۔ یہ سفر ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱ء میں میر عظمت اللہ
بلگرامی کے ساتھ ہوا تھا۔ دوسرا سفر ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء
میں بلگرام سے شاہ جہان آباد، لاہور، ملتان اور دوسرے علاقوں
سے گذرتے ہوئے سندھ پہنچے۔ وہاں سے چار سال کے بعد وسط ۱۱۴۷ھ
/ ۱۷۳۴ء میں جس راستے سے گئے تھے اسی راستے سے شاہ جہان آباد
واپس آ گئے یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد ایک تقریب
میں الہ آباد تشریف لے گئے ہیں، جو کہ بلگرام سے تقریباً دس میل،
دور ہے، آزاد پہلے اکبر آباد گئے اور وہاں سے الہ آباد رمضان
المبارک کے چاند کے طلوع کے وقت پہنچے۔ الہ آباد میں قیام کے
دوران دوبار بلگرام گئے۔ ان کا تیسرا اہم سفر مکہ معظمہ کا ہوا۔
یہ الہ آباد سے بلگرام آئے۔ یہاں ان کے دل میں حرمین شریفین
کی زیارت کا شوق ہوا سیوم رجب ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء کو رخت سفر
باندھا اور جبین نیاز کو بیت اللہ شریف میں جا کر جھکایا۔ چونکہ
حج کا زمانہ نہ تھا اس لیے تین دن مکہ میں قیام کر کے مدینہ منورہ
تشریف لے گئے اور وہیں پر عید منائی اور پھر حج کا فریضہ ادا کیا
سالم کشمیری نے ان کے حسب حال کیا خوب کہا ہے:

عید الفطر است بردر پیغمبر   شبیا اللہ گفتم بس یاؤر
این عید و مدینہ بخت من طالع من   انشاء اللہ مکہ و عید دگر (۱)

خان آرزو نے اس واقعہ کا مجمع النفائس میں ذکر کیا ہے۔
آزاد نے ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں دکن کی طرف کوچ کیا اور اورنگ آباد میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

آزاد کی عمر کا کافی حصہ شعر و شاعری میں گذرا۔ انہوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نغمہ سرائی کی، دیوان مرتب کیے۔ عربی کے دیوان میں تین ہزار ابیات ہیں۔ یہ عربی شاعری کو ایک خاص انداز سے ادا کرتے ہیں۔ اور عربوں پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"طوطی ہندم با قمریانِ عرب دمساز، نغمہ سنج، با خوش نوایان حجاز ہم آواز" (۲)

ان کو اپنے ہندی ہوتے پر ناز ہے ان کا عربی دیوان حرمین شریف، یمن اور مصر میں بہت مقبول ہے اور عربوں کی محفل میں ان کی عربی شاعری کو پڑھ کر ان کی یاد تازہ کی جاتی ہے، لگتا ہے کہ شوکت بخاری زبان حال سے کہہ رہے ہیں:-

شنیدہ اند بتان یمن کلام مرا   نوشتہ اند برآب عقیق نام مرا (۳)

آزاد کی بہت سی فارسی رباعیاں ملتی ہیں، یہاں ایک رباعی بہ طور نمونہ پیش کی جا رہی ہے:

---

(۱) خزانہ عامرہ ص ۱۲۵۔
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً

ای حامی دین محیط جود و احسان — حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تخت بدرگاہ سلیمان آورد — تو آل نبی را بدر کعبہ رسان[1]

یہ رباعی نواب آصف جاہ کی تعریف میں ہے۔ نواب اس کو سنکر بہت محظوظ ہوئے۔ دراصل یہ رباعی آیۂ کریمہ "و علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً" سے ماخوذ ہے۔

آزاد کے دو مشہور و معروف تذکرے خزانۂ عامرہ اور سروِ آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں یہ دونوں تذکرے فارسی زبان میں ہیں انہوں نے فارسی شاعری میں بھی اپنے قلم کا زور دکھایا ہے۔ ان کا ایک فارسی دیوان ملتا ہے۔ ان کی خط و کتابت آرزو سے تھی دونوں کے درمیان فارسی اشعار کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ آزاد نے دو جگہ مجمع النفایس میں آزاد کا اور آزاد نے "سروِ آزاد" اور خزانہ عامرہ میں آرزو کا حال لکھا ہے۔ خط لکھنے میں پیش قدمی آزاد کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ آرزو کے حالات زندگی کے بارے میں اہم معلومات آزاد کے تذکرے سروِ آزاد اور خزانۂ عامرہ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ آزاد کے کچھ فارسی اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

الٰہی نالۂ گرمی دلِ دیوانۂ مارا — کرامت کن نہال آتشینی دانہ مارا[2]

تو آں رسا ندبیا لین حضرت صیاد — ز مرغ بسمل ادمشت بال و پر باقی است[3]

---

(۱) خزانہ عامرہ ص ۱۲۶
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً

دلی کہ زلفِ نگاری بود شبستانش   ز شاہِ ہند فزون است شوکت وشانش (۱)

میر محمد افضل ثابت میر افضل اپنے زمانے کے اہم استاد زبان شمار کیے جاتے تھے۔ یہ ہمت خاں خلف اسلام خان والا بدخشانی کے برادرزادہ کے یہاں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حسان تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام اکتساب علم میں گزارے اور علوم درسی کو بعض مشہور علماء سے حاصل کیا اور اعلیٰ درجہ کی فضیلت حاصل کی۔ فن شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچایا، یہ کچھ دنوں تک شاہجہان آباد میں مقیم رہے اور یہیں اپنے علمی اور شاعرانہ فنون و مہارت کا اظہار کیا۔ مرزا عبدالرضا متین صفاہانی سے میر افضل کا مناقشہ رہتا تھا۔ اگرچہ تمام عمر مرزا عبدالرضا نے میر کی شاگردی کی، ان کی وجہ سے ان کی تربیت ہوئی۔ لیکن انہیں استاد قدیم سے انہوں نے آنکھیں پھیر کر ایک کشمیری شاعر سے تلمذ اختیار کیا اور ایک چار سو ابیات کا قصیدہ نظم کیا:۔

شرم است دلا سیلِ خون ز دیدہ بیار
ز شاہ تشنہ لبان آب چشم باز مدار (۲)

واقعہ متقبل اصفہانی کے ترجمے کے ذیل میں ایک مشہور واقعہ ہے۔ متقبل سلطان حسین مرزا صفوی عہد میں قابل اعتبار شخصیت کے مالک تھے، نادرشاہ کے عہد میں ہند آئے اور گجرات میں مومن خاں

---

(۱) خزانہ عامرہ ص ۱۲۶
(۲) ایضاً

ناظم کے پاس قیام کیا، وہیں ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ میر محمد افضل تمام عمر دنیا سے لاتعلق رہے۔ یہاں تک کہ فوت ہو گئے۔ ان کا مدفن شاہ جہان آباد میں ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں نے ان کی سال وفات کی تاریخ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء لکھی ہے جبکہ تذکرہ والہ داغستانی میں ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء درج ہے۔ والہ داغستانی افضل کے والد محمد عظیم ثبات کے ساتھ خاص اخلاص رکھتے تھے۔ ان کی وفات پر والہ نے یہ قطعۂ تاریخ کہا ہے:

استاد زباں کہ کرد تعلیم — اعجاز سخن بکلکِ صامت

تاریخ برائے رحلت او — فرمود فرد رحیل ثابت(۱)

ثابت کے اشعار کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

کشد چو صبح وصال تو شمع جان مرا — ببر بشہر پروانہ استخوان مرا(۲)

خون ناحق دست از دامانِ قاتل بر نداشت

دیدہ باشی داغہای جامۂ قصاب را(۳)

خار راہ تو گر از نشو و نمای افتد

عقدہ در کار من آبلہ پا می افتد(۴)

غلام علی حزین: ان کا پورا نام غلام حسین خان تھا یہ اصفہان سے تعلق رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ حزین زاہد مرشد شیخ صفی الدین اردبیلی کی اولاد میں سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب سلاطین صفویہ سے ملتا ہے

---

(۱) خزانۂ عامرہ ص ۱۷۳ — (۳) ایضاً ص ۱۷۴

(۲) ایضاً ص ۱۷۴ — (۴) ایضاً ص ۱۷۵

ان کے والد کا نام ابوطالب تھا۔ ایک مدت گذرنے کے بعد نادر شاہ کے ایران پر تسلط اور ناسازی روزگار کی وجہ سے ہندستان جنت نشان کی طرف رخ کیا اور یہاں بنارس میں سکونت پذیر ہوئے جس وقت نادر شاہ شاہ جہان آباد دہلی پر مسلط ہوا اور یہ شہر اس کی قہر مانیوں کا شکار ہوا تو حزین نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور خود کو روپوش کر لیا۔ افواج شاہی کے یہاں سے چلے جانے کے بعد وہ پھر ظاہر ہوئے لیکن جیسا کہ ان کی توقع تھی اس وقت کسی نے بھی ان کی قدر نہ کی۔ نازک مزاجی کی وجہ سے یہ ناقدری طبیعت پر گراں گذری اس لیے عازم لاہور ہوئے، ابھی زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ طبیعت خراب ہوگئی، یہ سمجھ گئے کہ وطن ہو یا غربت ان کے لیے دونوں ہی برابر ہیں، اس لیے جس وقت عمدۃ الملک امیر خان مرحوم الہ آباد سے آئے شیخ اپنی قدر شناسی کی توقع میں پھر شاہ جہاں آباد واپس لوٹ آئے۔ قسمت نے یاوری کی اور ان کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔ عمدۃ الملک نے تقریباً بیس لک دام بادشاہ سے ان کے لیے حاصل کیے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حزین نے اپنے رسالے میں اپنے حسب و نسب اور شعر و سیر کے بارے میں لکھا ہے اس میں اپنی برتری کا دعوی کیا ہے۔ گویا رسالے کے لکھنے کی غرض و غایت ہند اور اہل ہند خواہ وہ بادشاہ ہو یا فقیر کی مذمت کرنا ہے۔ یعنی ان کے خیال میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ ان کو اپنے ملک اور وہاں کے لوگوں سے ملا۔ اور ہندستان میں ان کے پایہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا ہے

۱۔ خزانہ عامرہ ص ۱۷۵

بنگال کی زیارت کے لیے عازم سفر ہوئے ہی تھے لیکن عظیم آباد سے ہی بنارس واپس لوٹ کر آ گئے :۔

ترسم نرسی بہ کعبہ ای اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است[1]

(یعنی مقصد یہ ہے کہ تو غلط راستہ پر جا رہا ہے تو اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکے گا۔)

شیخ علی حزیں اپنے کلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ :۔

"این دیوان کہ شہرت دارد دیوان چہارم است و سابق سہ دیوان در فترت افواعنہ تلف شد۔"

اس قول کے مطابق وہ دیوان جو اب دستیاب ہے ان کا چوتھا دیوان ہے۔ اور بقیہ تین تلف ہو چکے ہیں اگر یہ دیوان ان تینوں سے ملحق ہو جاتا تو اس قدر اعتراض کا باعث نہ بنتا کہا جاتا ہے کہ حزیں فاضل اور صاحب تصانیف تھے لیکن ان کی کوئی تصنیف علم حکمت و کلام میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے تخلص حزیں سے شہرت حاصل کی۔ یہاں ان کے دیوان سے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں :۔

ہست خلق عالم کاسہ دریوزہ می بینم گدا چوں بادشہ گرد د گدا سازد جہانی را[2]

پاس ناموس ہنرمندی فرہادم بود در رہ عشق اگر دست بکاری نزدم[3]

---

۱) فرہنگ عوام ص ۳۷ و ۱۶۱

۲) کلیات حزیں، مطبع نول کشور کانپور ص ۳۲۳

۳) ایضاً ص ۳۸۴

شاید شبی شمیم گلی رہ غلط کند | چشم طمع برخنۂ دیوار بستہ ام[1]

رباعیات :

ساقی! قدحی کہ دور گلزار گذشت | مطرب! غزلی کہ وقت گفتار گذشت[2]
ای ہم نفس از بہرِ دلِ زار بگو | افسانۂ آن شبی کہ با یار گذشت

حال دل آسودہ دلاں سوخت دلم | بیدردی این بی خبراں سوخت دلم[3]
دردِ دل ہیچکس مرا کار نہ کرد | بر حالِ سلامت طلباں سوخت دلم

معارضۂ حزیں و آرزو :

ہندستان میں اکبر کے عہد سے لے کر عالمگیر کے عہد تک مسلم الثبوت ایرانی شعراء کے کلام پر اعتراضات ہوتے رہے اور لطف یہ ہے کہ ان اعتراضات کی غرض سے نظم اور نثر میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ بیشتر خود اسی سرزمین کے علماء کے قلم کی گلکاری تھی۔ ظہوری، عرفی، زلالی جیسے اکابر کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا، معترضین میں فیضی، شیدا اور منیر جیسے بلند پایہ شاعر شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستانی علماء الفاظ کے دروبست، اسلوبِ بیان اور پرواز خیال میں ایرانی شعراء کی تقلید کو فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ مگر اس میں بھی دروغ نہیں ہے کہ ایرانیوں سے غلطی کا سرزد ہونا ایک انسانی طبیعت کا لازمی جزو تھا،

---

(۱) کلیات حزیں ص ۵۸۸

(۲) ایضاً ص ۷۵۱

(۳) ایضاً ص ۷۷۹

عہدِ عالمگیر تک جو اعتراضات ہوئے وہ ایرانی شعرا کے جستہ جستہ اشعار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ کسی ہندستانی نے کسی جلیل القدر ایرانی کے کلام کو موردِ اعتراض بنایا ہو اس کا علم نہیں، ایسا لگتا ہے کہ یہ کام محمد شاہی عہد کے لیے متعین ہو چکا تھا جس میں خان آرزو نے شیخ حزیں کے دیوان سے چن چن کر قابلِ اعتراض شعر نکالے اور ان کی غلطیاں دکھانے کے لیے ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کے نام سے لکھ ڈالی۔

ہندستان کے صاحبِ علم و ادب کی فنی عظمت کو منوانے کے لیے آرزو کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑے لیکن ایک آہنی اور مضبوط ستون کی طرح وہ اپنی جگہ اڑے رہے اور ایرانیوں سے اس حق کو منوا کر کے چھوڑا۔ اسی حق کو منوانے کے سلسلے میں ان کو حزیں سے برسرِ پیکار رہنا پڑا حزیں اس زمانے کے بڑے ٹھسے کے شاعر تھے جو ہندستان کے بڑے سے بڑے عالم فاضل کو اپنے ایرانی ہونے کی وجہ سے کمتر سمجھتے تھے، سودا کے متعلق ان کا یہ فقرہ " در پوچ گویان ہند نیستی" کافی مشہور ہے۔ ظاہر ہے اس انا پرست شاعر سے آرزو کی ملاقات کیونکر خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی تھی۔

آرزو اس معارضہ کی تاریخ نہیں بتاتے، معاصر تذکرہ نویس بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ حزیں کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ مدت تک ادھر ادھر بھٹکنے اور سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ۱۱۴۷ھ/۳۴-۱۷۳۳ء میں دہلی میں داخل ہوئے۔ یہاں اکثر علما، فضلا، شعرا، دادبار، امرا، ورؤسا حتیٰ کہ خود بادشاہ کو ان کی ذات سے

بہت عقیدت ہوگئی، چونکہ وہ کسی سے کچھ قبول نہ کرنے کے باوجود بڑی شان وشوکت سے رہتے تھے اس لیے عوام میں یہ مشہور ہوگیا کہ انہیں غیب سے امداد حاصل ہے۔[1] انہوں نے ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں تذکرۃ الاحوال اور ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں اپنا آخری دیوان مرتب کیا۔ ان سب کی روشنی میں قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معارضہ کا آغاز ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء کے بعد اور ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء سے پہلے ہوا، معارضہ کے اسباب کے متعلق تذکرہ نویسوں میں شدید اختلاف ہے یہ بیانات درج ذیل تین خانوں میں رکھے جا سکتے ہیں:

(۱) حزین و آرزو کی پہلی ملاقات کے وقت حزین کی سرد مہری

۲۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق حزین کی ہجویں۔

۳۔ حزین کی انتہائی نازک مزاجی اور تکبر

خان آرزو ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں لکھتے ہیں:

"سات آٹھ سال پہلے شیخ حزین کے کمالات کا ذکر سنکر مجھے ان کے معلوم کرنیکیلیے حد اشتیاق تھا، چونکہ اس زمانے میں شیخ پریشان حال تھے، میں نوکروں کو ٹھہرا کر اندر گیا وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص اپنے حال میں بیٹھا ہے جس کی برخود چیدگی، خویشتن داری اور اپنے فنون کمالات کی نسبت غلط آرائی کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ میں گھڑی بھر بیٹھ کر اُٹھ آیا۔ اس وقت صفدر خان مرحوم یاد آتے ہیں جو شیخ کے متعلق کہا کرتے تھے

---

(۱) مراۃ ص ۱۴۹-۱۴۸

یہ گدائے متکبر منظر ایالت ہے۔"

آرزو کی اس تحریر میں سرد مہری کا ذکر صراحتہً تو نہیں لیکن کنایتہً
تو ضرور بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان کا حزیں سے تمام عمر بات نہ کرنا بھی ثابت
کرتا ہے کہ وہ شیخ کے طور و طریق سے خوش نہیں ہوئے مگر محض کسی
شخص کا کسی سے مل کر خوش ہونا اس امر کا جواز بہم نہیں پہنچاتا کہ
پہلا شخص دوسرے کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے۔ اگر آرزو واقعی
بہت ذکی الحس اور زود رنج واقع ہوئے تھے تو شانِ خود داری کو
برقرار رکھنے کے لیے ان کا یہ فیصلہ کہ حزیں سے پھر نہ ملیں گے
کافی تھا۔

اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کی گنج بخشیوں اور ہندستانیوں
کی بے نظیر مہمان نوازیوں کا ذکر سن کر ایران توران سے بہ کثرت اہل
کمال ہندستان آئے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ہندستان
نے تمام دنیا میں قابلِ رشک شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس سرزمین
سیم و زر کو غیر ملکی اہلِ کمال بہت خراب نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان
میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے شاہی خزانہ کے زر و جواہر سے دامن
بھرنے اور میزبانوں کی مہمان نوازیوں سے خوب لطف اٹھانے کے
باوجود ہندستان اور ہندستانیوں کی ہجویں لکھ کر اپنی کور نمکی کا
ثبوت دے دیا۔ حیدر تبریزی جو اکبر کے عہد میں ہندستان سے
بہت سا مال و زر لے کر ایران واپس گئے۔ لکھتے ہیں :

ہر کشور ہند شادی و غم معلوم	آں ہا دلِ شاد و جانِ خرم معلوم
جائی کہ بیک روپیہ آدم زخرند	آدم معلوم و قدر آدم معلوم

دشنام طرازی کا یہ سلسلہ اکبر کے عہد سے محمد شاہی عہد تک جاری رہا، سب سے آخر میں علی حزین نے نظم و نثر میں ہجویں لکھ کر خوب کاغذ سیاہ کیے اور فحاشی میں اپنے تمام اگلوں پر سبقت لے گئے ان کی زہر چکانی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ تین مثالیں جو کلیات مطبوعہ میں ملیں گی کافی ہیں:

در ہند اگر کسی نہ رنجد از زاست — گویم طبقات خلق را بی کم و کاست
پیچ است کہ شش نمی توانش کردن — پاجی و دیوث و قحبہ و ہیز دگداست
دیدیم کہ سواد ہند حسرت زاست — روز کہ و مہ چو شام ہجران تار است
لیتہ است بہ کار ہمہ شان بخت گرہ — این جا گرہی کشادہ در شلوار است

ویرانۂ ہند کز صفا پاک بود — خاکش نمک دیدۂ ادراک بود
آبش بہ بغل شیشۂ ساعت دارد — مینای حباب او پُر از خاک بود

یہ تو عام طور پر ہندستان اور ہندستانیوں کی ہجو تھی، اب اس قطعہ کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس میں خاص طور پر کشمیریوں کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے

ہمہ حامی و دلاک بود اعلایش — ما بقی دلہ و ساد و دگر ارباب مطرب
چون حسب نامہ شان از ہمہ مخلوق جدا ست — و نجابت بہ عزازیل رسانند نسب
یک ازین قوم زدید است دو نوبت کشمیر — بر نہ گردد چو ز سوراخ بر آید عقرب
بزو نظمی کہ کند خانۂ آن ہا تحریر — ہر ج و سالم آن را ہمہ بیتی احزب

آرزو کے شاگردوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو آگے چل کر نہ صرف
بردئے غزل بنے بلکہ زبان اور فن کے امام ثابت ہوئے مثلاً
شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شرف الدین پیام
رآبادی مرزا مظہر جان جاناں، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، میر درد
نند رام مخلص، میر محمد عظیم ثبات، حاکم لاہوری، نورالعین واقف،
شگو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں؛

شاہ مبارک آبرو:

شیخ نجم الدین نام عرف شاہ مبارک، آبرو تخلص، یہ خان آرزو
شاگرد رشید، محمد غوث نور اللہ مرقدہٗ کی اولاد میں تھے۔ یہ اپنے زمانے
نہایت نامور اور مشہور تھے۔ اپنا کلام خان آرزو کو اصلاح کے
دکھایا کرتے تھے، ان کی سیدھی آنکھ نورِ بصارت سے عاری تھی
بار مرزا مظہر اور ان میں مکابرہ ہوا۔ مظہر نے ان کی مذمت میں
بیت کہی جو اس طرح ہے:

برو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے آبرو سب شاعروں کی جڑ ہے[1]

آبرو نے اس کے جواب میں کہا:

بستی ست پر چڑھے تو پان کھانا رسم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جانِ جاناں ... ہے[2]

تذکرۂ خوش معرکہ زیبا مولف سعادت حسن خاں ناصر ص ۹۵، آب حیات
۱۱۸ (۲) ایضاً۔ آب حیات میں یہ شعر اس طرح ہے۔

شرف الدّین مضمون؛

ان کا نام شرف الدّین اور تخلص مضمون تھا۔ یہ فریدؒ شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ اکبر آباد ان کا اصلی وطن تھا، دلی میں آ کر بس گئے تھے۔ اصل پیشہ سپہ گری تھا لیکن سلطنت کی تباہی کی وجہ سے سپہ گری کا پیشہ چھوڑ کر شاعری پر قناعت کی اور زینت المساجد میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ ان کے نسب کی بزرگی اس وجہ سے ظاہر ہے:

کرے کیوں نہ شکر لبوں کو مرید　　　　که دادا ہمارے ہیں بابا فرید[1]

میکدہ میں گر سراسر فعل نامعقول ہے　　　　مدرسہ میں کبھی تو اک فاعل ہے اک مفعول ہے[2]

مضمون تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب　　　　غصّہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے[3]

میر تقی میر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ شرف الدین مضمون کے شعر میں اسم کی جگہ نام تھا لیکن جب آرزو نے اس شعر کی اصلاح کی تو نام کی جگہ اسم کر دیا۔ کیا خوب اصلاح کی ہے۔

---

(۱) آب حیات ص ۱۱۸

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

حاکم لاہوری

حاکم لاہوری کے باپ محمد شاہی عہد میں پنج ہزار امیر تھے۔ ان کو نوبت، علم اور نقارہ بھی حاصل ا، حاکم نے ایک تذکرہ "شعرا مردم دیدہ" کے نام سے لکھا تھا، اس میں ں نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنا دیوان سراج الدین علی خان رزو کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیا تھا اور آرزو نے غور سے ہ کر اپنی رائے حواشی پر لکھ دی تھی۔ حاکم نے اپنی غزل کے مقطع میں بھی رزو سے عقیدت کا اظہار کیا ہے:

طرفہ شوری این غزل حاکم بہ لاہور افگند ہنین از فیض خان آرزو گیرد نمک

ان آرزو نے حاکم کی اس غزل کو دیکھ کر برجستہ کہا تھا:

گر تو با این ہم پسندی حاکمی ست شعری آرزو را رتبہ

حاکم نے یہ غزل آرزو کی ایک غزل پر کہی تھی۔

حاکم کے دیوان پر آرزو نے جو اعتراض کیے تھے وا رستہ سیالکوٹی نے ان کے جواب میں ے رسالہ "جواب شافی" کے نام سے لکھ کر اعتراضات رفع کرنے کی کوشش ی۔ اس کے باوجود حاکم اور آرزو کے درمیان دوستانہ مراسم رار رہے۔ آرزو نے مجمع النفائس میں نہایت اچھے الفاظ میں حاکم ذکرہ کیا ہے اور حاکم بھی آرزو کی وفات کے بعد احترام اور خلوص سے ، کا ذکر کرتے ہیں۔

رزا مظہر جان جاناں:

ان کے والد کا نام مرزا جان تھا، ان کا نام اپنے والد کے نام نا سبت کی وجہ سے مرزا مظہر جان تھا اور جاناں ان کا تخلص ہے ن یہ اپنے پورے نام مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے مشہور ہوئے

جانِ او اول مظہر درگاہ شد   جان جاناں خود مظہر اللہ شد (۱)

سرد آزاد میں ہے:

جدا علای او امیر کمال الدین در اوائل مائتہ تاسعہ از خطۂ طائف بجذب قسمت بحدود ترکستان رخت اقامت انداخت و بہ فرمانروائی بعضی از ممالک عمر گزرانیده. اولاد کثیر بہم رسانید، از آنہا امیر مجنون و امیر بابا در حین فتح ہندوستان کہ بر دست ہمایوں پادشاہ اتفاق افتاد در این مملکت وارد شدند. از آن باز خدمت و رفاقت سلاطین گورگانیہ شعار مردم این خاندان بود (۲)

یہ نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد امیر کمال الدین ترکستان سے ہندوستان تشریف لائے۔ ان کے والد عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے دادی اسد خان وزیر عالمگیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھی ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں جبکہ عالمگیر دکن میں فوج کے ساتھ تھے ان کے والد نوکری چھوڑ کر دلی واپس آگئے۔ یہ گیارہ رمضان جمعہ کے دن ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں

---

(۱) سرو آزاد ص ۲۳۱

(۲) ایضاً

ہندستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا مذہب حنفی اور مشرب نقشبندی ہے ظاہری نشو ونما اکبرآباد میں ہوئی لیکن باطنی تربیت شاہ جہان آباد میں حضرت سید محمد بداؤنی نقشبندی کے زیر سایہ ہوئی۔ خان آرزو ان کے استاد تھے اور مظہر ان سے اپنی شاعری میں اصلاح لیا کرتے تھے مظہر جانِ جانان کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

باغباں رو بمن آور کہ ثنا خوان توام
چون صبا باد فروشِ گل وریحانِ توام[1]

مرا گشت است وباز این مرگ با من سرگرانی دارد
ترا بر نعشِ من چون دید گفت این مردہ جان دارد[2]

چشم بر چشم چو افتاد گرفتاریہاست حلقہ بر حلقہ چو افزود گرزنجیراست[3]

میر تقی میر

آرزو سے اس دور کے ممتاز شعرا و فضلا سے علمی و ادبی معرکہ آرائی ہوئی، اس سلسلے میں بعض تفاصیل کا ذکر یہاں بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ آرزو اور میر میں کیونکر سوئے مزاجی پیدا ہوئی، اس کے اسباب کیا تھے، اور کون خطا پر تھا، جب تک میر کا تذکرہ نکات الشعرا سامنے تھا نہ تو اس سوئے مزاجی سے

---

(۱) سروآزاد ص ۲۳۲ (۲) ایضاً (۳) ایضاً

کوئی واقف تھا اور نہ کسی کو اس کے اسباب کی تلاش تھی کیونکہ میر نے اپنے تذکرے میں آرزو کے متعلق جو اظہار خیال کیا تھا وہ ان الفاظ میں تھا:

"آب و رنگِ باغ نکتہ دانی، چمن آرای گلزار معانی متصرف ملک زور طلب بلاغت، پہلوانِ شاعر عرصہ فصاحت، چراغ دودمان صفائی، گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خاں آرزو سلمۂ تعالیٰ ابداً شاعر زبردست تا درسخن عالم فاضل تا حال ہمچو ایشاں بہ ہندوستان جنت نشان بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود، شہرۂ آفاق درسخن فہمی طاق۔"

صاحب تصنیف دہ پانزدہ کتب و رسالہ در دیوان و مثنویات حاصل کمالات او شان از منزہ بیان است ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ شاگرداں بزرگوارند برای تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ این بی اعتبار را اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند"(۱)

اسی تذکرہ میں مرزا معز فطرت کا حال لکھتے ہوئے میر نے آرزو کو "استاد و پیر و مرشد بندہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے کئی تذکرہ نگاروں نے میر کے حال میں میر کو خان آرزو کا شاگرد اور ان کا تربیت یافتہ کہا ہے۔ مثلاً مخزن نکات میں ہے:(۲)

"درخدمت خان آرزو کہ خالوئے او بود لختی دانش آموخت"

۱۔ حکایت الشعراء ص ۳ (۲) گلشن ہند ص ۲۰۶

گلشن ہند میں ہے۔

"پرورش انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے (۱)

شمیم سخن میر کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"میر متخلص ہمشیر زادہ و شاگرد سراج الدین علی خان آرزو" (۲)

اسی طرح مردان علی خان مبتلا کے تذکرے گلشن سخن میں میر کے ذکر کے تحت :

"میر تقی میر شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو ست" (۳)

میر کے ذکر میں اس قسم کے خیالات کا اظہار میر حسن کے تذکرے "شعرائے اردو" میں کیا گیا ہے :

"برادر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو ہم از شاگردانِ اوست"

اسی کی پابندی اردو کے تقریباً سب سے آخری اور سب سے بہتر تذکرے "گل رعنا" میں کی گئی ہے :

"جو کچھ بھی ہو میر نے خان آرزو کے دامن تربیت میں پرورش پائی"

---

(۱) گلشن ہند۔ ص ۲۰۶ (۲) شمیم سخن ص ۲۱

(۳) تذکرہ گلشن سخن ص ۸۷ ب (۴) میر کی آپ بیتی ص ۹۳ - ۹۶

گویا ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء تک جو گل رعنا کی تیسری اشاعت کی تاریخ ہے ۔
اردو ادب میں شاید ہی یہ بات کسی کو معلوم ہو کہ خان آرزو
اور میر میں کوئی کشیدگی تھی لگ بھگ ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء تک میر کو
آرزو کا تربیت یافتہ اور ان کا شاگرد مانا جاتا رہا ہے لیکن ۱۳۰۷ھ
/ ۱۸۹۰ء میں پہلی بار بابائے اردو مولوی عبدالحق نے "ذکر میر" کے
عنوان سے میر کی آپ بیتی کو اپنے حاشیوں اور مقدمے کے ساتھ
انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کیا۔ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہے
کہ اس سے قبل اردو کے خواص کی نظر اس کشیدگی پر تھی یا نہیں
لیکن میر اور آرزو کے کشیدہ تعلقات کا مسئلہ اردو ادب سے
دلچسپی رکھنے والے عوام کی نظر کے سامنے نہ تھا۔ "ذکر میر" کی اشاعت
کے بعد یہ اردو ادب کا عوامی مسئلہ بن گیا، اس واقعہ پر نظر ڈالنے
سے پہلے میر اور آرزو کے رشتہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے
میر کے والد کا نام سید محمد علی تھا جنہیں ان کے زہد اور عبادت کی
وجہ سے میر محمد متقی بھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے دو نکاح کیے پہلا
سراج الدین علی خان کی بہن سے اور ان کی موت کے بعد میر تقی میر
کی والدہ سے۔ پہلی بیوی سے دو لڑکے تھے حافظ محمد حسن اور محمد حسین
اور دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے ایک میر محمد تقی اور دوسرے
محمد رضی۔ میر نے "ذکر میر" میں خان آرزو کی برائی کی ہے۔ جبکہ
تذکرۂ "نکات الشعرا" میں جو اس سے بعد میں لکھا گیا ان کی عقیدت
و محبت کے ساتھ تعریف کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ
تذکرہ ایک عام چیز تھی اور سب لوگوں کی نظر سے گزرنے والی اس

لیے میر نے خانگی اختلافات کو اس میں داخل نہیں کیا۔" ذکر میر" ایک حد تک ذاتی چیز تھی اس لیے یہاں اختلافات کے چہرے سے نقاب اٹھا دی ہے۔ یہ دلیل وزنی اور قطعی قرار نہیں دی جاسکتی۔

میر باپ کے مرنے کے بعد تلاش معاش میں دلی آئے اور امیر الامرا کے نوکر ہو گئے، نادر شاہ کے حملے کے دوران امیر الامرا مارے گئے اس لیے میر بے روزگار ہو کر دلی سے اکبر آباد آ گئے۔ یہاں لوگوں نے ان کے باپ کی محبت کا کچھ پاس نہ کیا میر کی آپ بیتی میں آرزو کے متعلق یہ لکھا ہے:

" مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچا اور بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کا احسان اٹھایا یعنی کچھ دنوں ان کے ساتھ رہا اور شہر کے لوگوں سے کچھ کتابیں پڑھیں پھر جب اس قابل بن گیا کہ کسی کا صحیح مخاطب بن سکوں تو بھائی کا خط ماموں کے نام پہنچا کہ میر تقی فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنا چاہیے بلکہ دوستی کے پردہ میں کام تمام کر دینا چاہیے۔ وہ عزیز بھی دنیادار تھے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا برا چاہنے لگے۔ اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارتے اور بچ بچ کر رہتا تو اول فول بکتے۔ ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے میں کیا بتاؤں کہ ان سے کیا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کہ کیا رنج اٹھائے ہیں ہر چند صبر و ضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان کی امداد ہی

کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر
درکار ہے۔ میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور
میں پاگل ہو گیا۔ مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی"۔(۱)

اپنے اس پاگل پن کی تفصیل بھی خود میر نے لکھ دی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس سے میر کے اعصاب کی کشیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے پاگل پن کی کیفیت جو یقیناً انہوں نے دوسروں سے سنی ہوگی میر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"جس کوٹھری میں رہتا تھا اس کا دروازہ بند کر لیتا اور
ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا۔ چاند نکلتا تو میرے لئے
قیامت ہو جاتی۔ اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو
دیکھتا آیا جب منھ دھلاتے وقت دایہ چاند چاند کہتی
اور میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا لیکن نہ اس طرح
کہ دیوانگی کی حد تک نوبت پہونچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ
جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند
کر دیں اور مجھ سے دور بھاگنے لگیں"۔(۲)

آخر یہ مجنونانہ حالت اتنی بڑھی کہ میر زندانی ہو گئے اور ایک روز:

"خالوی کذائی بر طعامم طلبید۔ تلخی ازو کشیدم بی مزہ
شدم، دست در طعامم ناکردہ برخاستم"۔(۳)

میر نے آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی اور امیر خان کی حویلی میں سکونت اختیار کر لی؛

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۹۲ - ۹۶
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً

"دریں ایام من از نا مساعدتِ ایام، ہمسائیگی خالو گذاشتہ، نظر برین کہ مرا بہ چشم کم خواہد دید، در حویلی امیر خان مرحوم ..... سکونت اختیار کردم و بہ لطائف الحیل بسر بردم" (۱)

جب خان آرزو نواب شجاع الدولہ کے یہاں چلے گئے تو میر نے اپنے طنز کے سب تیر ختم کر دیئے :

"خالوی من باد یہ پیمائی طمع شد در لشکر شجاع الدولہ بہ این توقع رفت کہ برادران اسحٰق خان شہید آنجا ہستند، نظر بر حقوق سابق رعاینی خواہند کرد، جز باد بدستش نیامد۔ لکد زمانہ خورد و ہم آنجا مرد" (۲)

حافظ محمد حسن نے آرزو کو میر کے خلاف خط لکھا جس میں غلط بیانی سے کام لیا اور میر کے خلاف خوب بھڑکایا۔ میر نے اس خط کا ذکر اپنے تذکرے میں کیا ہے :

"میر تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیت او نباید پرداخت و در پردۂ دوستی کار خس باید ساخت آن عزیز دنیا دار واقعی بود، نظر بخصوصت ہمشیر زادۂ خود، بدین اندیشید .... چہ بیان کنم کہ از و چہ دیدم چگویم کہ چہ حالت کشیدم، ہر چند بلبہ دھانی نمی خواستم، اما سلاخی نمی گذاشت، خصمی او گر بہ تفصیل بیان کردہ

(۱) ذکر میر ص ۶۴
(۲) ایضاً

دفتری جدا گانہ می باید، خاطر گرفتۂ من گرفتہ تر شد،
سودا کردم، دل تنگم تنگ تر گردید، وحشتی پیدا کردم"(۱)

میر کے بیان کے خلاف ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میر نے آرزو سے کسب فیض کیا تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ:۔

"میر برادر زادۂ سراج الدین علی خان آرزو ہم از شاگردان اوست"۔

قائم لکھتے ہیں کہ:

"میر در خدمت خان آرزو کہ خالوی او بود لختی دانش اندوختہ"(۲)

گلشن سخن میں لکھا ہے کہ:

"میر تقی میر شاگرد سراج الدین علی خان آرزوست"۔

مرزا لطف علی نے لکھا ہے کہ:

"میر نے خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے"۔

سعادت خان ناصر نے "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" میں میر اور آرزو کے تعلقات پر زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔

میر یہ نقل خود فرماتے ہیں کہ عنفوان جوانی میں جوش وحشت و استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور کام و دہن

---

(۱) مجمع النفائس ص ۱۰۱

(۲) مخزن نکات ص ۴۱

ہزرہ گوئی پر راغب ترک ننگ ونام رسوائے خاص و عام پسند آئی ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کار رویا رکھا خان آرزو نے کہا کہ اے عزیز دشنام موزوں دعائے ناموزوں سے بہتر اور ریختہ کے پارہ کرنے سے تقطیع شعر خوشتر ہے چونکہ موزونی طبع جوہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہو گئی لہذا اصلاح دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا کبھی کبھی دو چار شعر جو خان آرزو کی خدمت میں پڑھے پسند فرمائے اور تاکید شعر و سخن زیادہ سے زیادہ کی۔ ایک دن خان آرزو نے کہا کہ آج مرزا سودا اپنا یہ مطلع نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے:

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

میر نے اس کو سنکر فوراً یہ مطلع پڑھا:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خان آرزو اس کو سنکر اچھل پڑے اور کہا خدا چشم بد سے محفوظ رکھے"

اس کے علاوہ میر اور خان آرزو کی تصانیف کا باہم مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر نے آرزو کی صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کی استعداد و قابلیت بڑی حد تک آرزو کی رہین منت ہے میر نے بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی استعمال کی ہیں جو ان سے قبل بالعموم دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتی ہیں مثلاً

طفلانِ نہ بازار آوارہ لڑکے جن کے گھر در نہ ہو

بے تہ	بے اصل، بے حوصلہ
بزآویزی	الٹا لٹکانا، سزا
بزگیری	چوری
یال وگوپال	کروفر
دربائے لنگر وار	غرور
سرنشین	بے محل، پیچھے چلنے والا
غنچہ پیشانی	ترش رو
بی ہیچ	فرومایہ
شیشہ جان	نازک مزاج
زنخ زن	بے ہودہ گو

مگر یہ وہ الفاظ ہیں کہ جن کے متعلق آرزو نے چراغ ہدایت میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ فرہنگ جہانگیری، سروری اور برہان قاطع وغیرہ میں کہیں نہیں ہیں اور صرف ان کی تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہیں میر کے یہاں ان کا استعمال اور اردو کے دوسرے محاورہ دانوں کے یہاں ان کا ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ میر نے خان آرزو سے کسب فیض کیا تھا

میر اور آرزو کے اختلافات کی مختلف وجہیں بیان کی گئی ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے :۔

(۱) آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے تربیت پائی۔ مگر میر کی نازک مزاجی غضب کی تھی، غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ

ہو گئے(۱)"

(۲) ڈاکٹر عبدالحق اور صاحب گل رعنا اسے تسلیم نہیں کرتے۔

(۳) تذکرہ قاسم نے اس کا سبب میر کی نخوت قرار دیا ہے۔

(۴) خود میر نے اس کا کوئی معقول سبب نہیں لکھا ہے جس کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ زندانی ہو جائیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میر کی انفرادیت بے انتہا بڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنے سوا ساری دنیا کو مدہوش اور بے گانہ سمجھتے تھے۔ ان کو اپنے فن کے کمال کا غیر معمولی احساس تھا:

اگرچہ گوشہ نشین ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شعر نے روئے زمین تمام کیا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اسی لیے خان آرزو کی استادی کا ذکر انہوں نے مروتاً یا مصلحتاً ان کی زندگی تک روا رکھا، اس کے بعد غیر ضروری سمجھ کر اس سے انحراف کیا خان آرزو کی زندگی میں نہ میر نے ان کی کوئی شکایت کی اور نہ معاصرین نے اس ناخوشگواری کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ حد یہ ہے کہ آرزو نے مجمع النفائس میں میر کی بہت تعریف کی ہے:۔

" افصحای وادلی زمان وزمن وازہ آن بارگہ کوکب اقبال شان پیوستہ صاعد مصاعد اجلالت رتبہ عالی مرتبہ نائب انور راقم کام روای نامداران عالم، و صاحب سیف و قلم شد ندوبی اغراق تکلف کہ نام نامیش درعرصہ شش جہت

(۱) آب حیات ص ۲۰۲

بمیان جہل نیک نامی مشتہر، وصیت و اخلاق خوش اتفاق دلکش آن جناب در بلاد ربع مسکون مشہورتر، بنا بر کثرت امورِ مملکت و قلتِ فرصت بتلاش شعر توجہ نفرمودند لیکن کمالاتِ سخن دانی و معنی یابی بدیہ، و خوبیٔ ذہن رسا و رفعتِ طبیعت عالی زاید الوصف است دفترہا باید کہ تحریر نماید۔"(۱)

رای رایان آنند رام مخلص

مخلص آرزو کے ممدوحین میں سے تھے۔ اور بعد میں شاعری میں ان کے شاگرد بنے۔ یہ لاہور کے راجہ ہردی رام کھتری کے بیٹے تھے۔ سب سے پہلے لاہور اور ملتان کے گورنر محمد شاہ اور پھر سیف الدولہ عبدالصمد خان وزیر اعتماد الدولہ قمرالدین خان کے وکیل بنے۔ آنندرام نے آرزو کی سرپرستی کی اور ان کو مالی مدد بھی فراہم کی، ان کو منصب اور جاگیر بھی دلوائی۔ یہ فارسی کے شاعر تھے اور مخلص تخلص کرتے تھے۔ یہ سب سے پہلے بیدل کی شاگردی میں رہے۔ اس کے بعد آرزو سے وابستہ ہوئے مخلص ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں دارفانی سے کوچ کر گئے۔ آرزو کے حوالے سے بانکی پور کیٹلاگ ج ۸ ص ۸۴ پر درج ذیل عبارت ملتی ہے جو مجمع النفائس سے ماخوذ ہے

"از حسن و اخلاق و آدمیت و فضایلش تا کجا نوشتہ آید۔
باعث بودن فقیر در شاہ جہان آباد دہلی اخلاص اوست از مدت سی سال تا الیوم سررشتہ کمال محبت و مودت

---

(۱) مجمع النفائس ص ۱۳۷

را از دست نه داده، در عنفوان جوانی اشعار خود را از
نظر مرزا عبدالقادر بیدل مرحوم گذرانیده از آن
زمان باین عاجز محشور و مربوط است۔ الغرض درین
جزو زمان از منتخبان روزگار است۔ دیوان شعر و
انشا و کتب متعدد دارد"

خان آرزو کو مخلص کے اشعار بہت مرغوب تھے۔ انہوں نے اپنے تذکرے
مجمع النفایس میں مخلص کے اشعار تقریباً پانچ صفحات پر نقل کئے ہیں

بر دل ما تیرہ روزاں از صف مژگاں صفت
آنچہ از فوج دکن بر ملک ہندوستان گذشت

دل بتاراج سپاہ مژہ سبزان رفت — دہلی و شورش افواج دکن یا قسمت
ہر کسی سود لبقدر ہمت خود می کند — عالمی خواہان لعل و من خریدار دلم

حقوق صحبت گل بر تو بسیار است ای بلبل
مبادا در چمن غافل در ایام خزان باشی

ای جلوہ گاہ وادی ایمن بخود مناز
آخر دل خراب بیابان شوق کیست

جای کہ جرم را بکرم باز میدہند
گر طاعتی نکردہ پذیرند دور نیست

خوشگو خوشگو قوم کے ہندو ہیں، یہ نوکری پیشہ تھے، ایک مدت تک دنیا داری کے لباس کو ترک کر رکھا تھا اور فقرا کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ مرزا افضل سرخوشؔ، حضرت شیخ سعد اللہ گلشن کے فن سے بہت استفادہ کیا۔ یہ مشہور شاعر اور مصنف تھے۔ شعر خوب کہتے تھے اور اشعار میں نازک مضمون باندھا کرتے تھے۔ انہیں اپنے تذکرے سفینۂ خوشگو کی وجہ سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں متقدمین، متاخرین اور معاصر شعرا کے حالات نہایت مفصل بیان کیے ہیں۔ خوشگو نے اس تذکرے کو مکمل کرنے میں تقریباً دس سال ۱۱۳۷ھ/ ۱۷۲۴ء سے ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء تک صرف کیے ہیں ان کا یہ تذکرہ تقریباً نادر شاہ کے حملے کے دوران (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء) مکمل ہوا۔ نادری حملے کے نتیجہ میں ان کو فوج میں بھرتی ہونا پڑا اور یہ تقریباً آٹھ سال پنجاب میں رہے۔ اس کے بعد ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں دہلی واپس آئے۔ سفینہ کو اپنے استاد آرزو کے حضور میں پیش کیا۔ انہوں نے اس پر کچھ حاشیے لکھے اور اس میں دیباچہ کا اضافہ کیا آرزو نے مجمع نفائس میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ خوشگو تقریباً پچیس سال تک ان کے رفیق رہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں ان کی ہدایات کو مدنظر رکھا۔ خوشگو نے اپنی زندگی کے آخری ایام الہ آباد میں، عمدۃ الملک امیرخان بہادر مرحوم کی خدمت میں گزارے۔ نواب نے ان کے لیے دو روپیہ یومیہ مقرر کر دیا تھا جو نواب کی زندگی تک ملتا رہا۔ ان کی انگوٹھی پر یہ تحریر ظاہر کرتی ہے کہ ان کو

آرزو سے کس قدر دلی لگاؤ تھا۔

"آرزومند وصل او خوشگو" (۱)

سفینۂ خوشگو کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرہ کا مسودہ ۱۱۶۱ھ/۹-۱۷۴۸ء میں خان آرزو کے زیر مطالعہ رہا اور بعض وہ امور جو مجمع النفائس میں نہیں پائے جاتے سفینۂ خوشگو سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آرزو نے خوشگو کو خود اپنے احوال زندگی اپنے قلم سے لکھ کر دیئے تھے تاکہ وہ اسے اپنے سفینہ میں داخل کر لیں:

فقیر..... در سال ۱۰۹۹ھ/ ولادت یافتہ ...

غیر از کتاب گلستان و بوستان و پندنامہ و نام حق و آنہم در پنج شش سالگی دیگر کتاب فارسی نخواند، تا چہاردہ سالگی بکسب علوم عربیہ اشتغال داشت، غیر از آنکہ والد مرحوم در ہنگامیکہ از لشکر عالمگیر بگوالیار آمدہ بودند درخلال شبہا صدہا و صد بیت از اشعار معاصرین یاد میدادند ہمہ سرمایۂ شاعری من شدہ۔ در عمر چہاردہ سالگی مرا ذوقی بہ شعر پیدا گردید و از شہر متھرا کہ خاک قیامت خیز و سرزمین شور انگیز است، جنون شعر در سرمن افتاد و بعد چندگاہ کہ باز بگوالیار رفتم دوسہ ماہ بخدمت میر عبدالصمد سخن کہ بعلاقہ مشرفی جزیہ در آنجا تشریف داشتند اشعار خود گزرانیدم حسب تقدیر آسمانی میر مرحوم

(۱) مجمع النفائس نسخہ بانکی پور۔ ص ۱۲۷

از گوالیار به اکبرآباد تشریف بردند. فقیر مدتی با بیکسی
و تنهائی دمساز بود. اتفاقاً صحبت میر غلام علی احسنی
تخلص دست داد. چندی کسب شعر در ایشان نموده
... و این مدت طالب العلمی هم بقدری می کرد. بعد ازان
اتفاق رفتن بسمت دکن افتاد. نارسیده بلشکر
واقعهٔ غفران پناه عالمگیر روی داد، باز العود احمد خوانده
به گوالیار که وطن اجداد مادری بود رسید. بعد ازان
بتقریبی به اکبرآباد که مسقط الراس است رسیده
پنج سال کتب متداول عربیه را پیش مولانا و مخدومنا
شیخ عماد الدین المشتهر به درویش محمد قدس سرهٗ گذرانید
و درین بین مشق شعر نیز کرد. اکثر درین ایام صحبت یاران
موزون مثل شاه عشق و میرزا حاتم بیگ حاتم و میان
عظمت الله کامل و محمد مقیم آزاد و میان علی عظیم
خلف الصدق میان ناصر علی و دیگر صادر و وارد دست
بهم میداد تا اوایل عهد فرخ سیر بتقریبا نوکری در
شاه جهان آباد رسیده بخدمتی از خدمات گوالیار متعلق
گردیده شش سال دیگر در وطن بسر برد درین بین
شعر گفتن کم اتفاق می افتاد.

بعد ازان در وقت تسلط سادات بارهه
خدمت مذکور تغیر شد فقیر باز باردوی بادشاهی که
بتقریب رفع هنگامهٔ نیکوسیر بود، در اکبرآباد رسید

بازآنجا بخدمت تواریخ نگاری گوالیار متعلق گشته وقریب دو ماه بسر کرده کہ درین اثنا اختر دولت سادات رو بہبوط آورد و فقیر نیز از خدمت مذکور معزول شده در دار الخلافہ شاہ جہان آباد رسیده قریب سی سال است کہ در اینجا می گذارم"

نور العین واقف یہ شعرای پنجاب میں سے تھے۔ ان کے باپ یا اجداد بٹالہ کے قاضی تھے۔ بٹالہ مضافات لاہور میں واقع ہے علوم متداولہ سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ یہ فارسی کے شاعر تھے اور آرزو کی بہت عزت کرتے تھے اگرچہ ان کو آرزو سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا تا ہم وہ ان کے معتقدین میں سے تھے۔ وہ بار بار اپنے اشعار آرزو کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں :

" پیش ازیں بمعرفت محمد علی تجرد اخلاص غائبانہ بافقیر آرزو بہم رسانیده اکثر درخواست اصلاح اشعار خود نموده۔ وچون این عاصی ناقص را از تربیت خود فرصت نیست بخود گمان استادی ندارد و چند بار ابا نمود لیکن بسبب آنکہ آن مرد عزیز بسیار بجد شده یک مرتبہ ہرچہ ہرجا بہ خاطر رسیده نوشتہ فرستاد، بہم رسیده کہ اگر چندی دیگر بہمیں وضع مشق برخود روا دارد گمان دارم کہ بپایۂ اعلیٰ رسد۔ چون در گوشۂ ملک واقع شده وبقول خودش در تمام عمر صحبت بہ از خودی ادراک نکرده

آنچہ می گو یداز مغتنمات است۔ پس اگر اتفاق صحبت
بزرگانِ فن او را دست میدہد ترقیات نمایاں خواہد نمود۔
الغرض غنیمت کسی است خدا لیش سلامت دارد"

درغم ہجر تو صد زخم ملامت دارم کس نیاید بسرم بیتو کہ شمشیر نشد(۱)

محمد عظیم ثبات ثبات میر محمد افضل مرحوم کے بیٹے اور ایک
دردلیس مشرب نوجوان تھے۔ والد کے زمانے میں شعر سے چنداں رغبت
نہ تھی ان کے انتقال کے بعد اساتذہ کے کلام سے استفادہ کیا اور اشعار
کہے درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شیخ علی حزین کے بہت سے اشعار
کے ماخذ حاصل کیے۔ ان میں سے اکثر تذکرہ والہ داغستانی میں موجود ہیں
وہ اپنا ایک دیوان جس میں تقریباً چار ہزار بیت ہیں، آرزو کے
پاس اصلاح کے لیئے لائے۔ آرزو نے اس پر سرسری نظر ڈال کر اپنے مقدور
بھر اصلاح کرکے اُن کے حوالے کر دیا۔ ثبات کے والد اکثر آرزو کی
رائے سے متفق نہ ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک ثبات کی شاعری کا
تعلق ہے آرزو اُن کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔

"اگرچہ بافقیر بر سر شعر بیت الحال گاہی صلح وگاہی جنگ داشت
لیکن واقعہ این است کہ ہزار حیف کہ دیگرا مثال اوی
درا ین جزو زماں کجا بہم میرسد"۔(۲)

ثبات بہت کم عمری میں فوت ہوگیئے، بقول آرزو:

" ہزار حیف کہ نہال عمرش نرود لیصرصر مرگ از پا درافتاد وجہان
بی ثبات را العود ...

---

(۱) مجمع النفائس قلمی بانکی پور ص ۵۳ (۲) مجمع النفائس ص ۹۹

زطور پیرِ مغاں آنچہ یافتیم ثبات   کلید میکدہ شاید بماحوالہ کنند[1]

مرزا محمد رفیع

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ دہلی شہر کو ان کی شخصیت پر ناز تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا جو کہ میرزایان کابل میں سے تھے۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا شفیع بہ غرض تجارت ہندستان آئے اور ہند کی خاک نے اُن کو اس طرح تھاما کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ سودا ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ دلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازے کے علاقے میں ان کا گھر تھا۔ ان کی نشست ایک بڑے پھاٹک پر رہتی تھی، دہلی کی تباہی میں وہ پھاٹک بھی تباہ ہوگیا۔ سودا پہلے سلیمان قلی خاں وداد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے یہ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے لیکن ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کیے یہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ آرزو نے کہا مرزا فارسی اب تمہاری مادری زبان نہیں اس میں تم اس قدر ماہر نہیں ہوسکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابلے میں تعریف کے قابل ہو تمہاری طبیعت موزوں ہے، شعر سے نہایت مناسبت رکھتے ہو اس لیے تم اردو میں شعر کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو جاؤ گے۔ مرزا کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور دیرینہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ ان کا کلیات بہت مقبول ہے اور اہل علم کی محفلوں میں بہت قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کے قصائد غزل کے مقابلے میں بہت مقبول ہیں۔ شروع کے اردو قصائد بزرگانِ دین کی مدح اور اہلِ دولت کی تعریف میں ہیں[2]

---

(۱) مجمع النفائس ص ۱۰۱

اسی طرح چند فارسی کے قصائد، چہ بیس مثنویاں ہیں، بہت سی حکایتیں اور منظوم لطائف بھی ان کے شاعرانہ فن اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں ایک فارسی کا مختصر سا دیوان، نہایت بہترین اور لاجواب غزلیں، رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت ترجیع بند اور ایک شعرائے اردو کا تذکرہ ان کی تصنیفات میں شامل ہیں

ایک بہت مشہور لطیفہ سودا اور خان آرزو کی نسبت سے مشہور ہے کہ ایک بار خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ منعقد ہوا جیسا کہ اکثر ہوا کرتا تھا سودا ان دنوں نوجوان تھے انہوں نے یہ شعر پڑھا:

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو   اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

یا تو لاعلمی کے سبب یا ان کی آتش بیانی کے ڈر کی وجہ سے حاضرین میں سے کوئی نہ بولا لیکن آرزو سے رہا نہ گیا تو فوراً فی البدیہہ یہ شعر پڑھا جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سودا کے شعر میں قدسی عقیدہ کا خیال دھرایا گیا ہے:

شعر سودا حدیث قدسی ہے   چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

آلودہ قطرات عرق دیدہ جبین را   اختر زفلک می نگرد روی زمین را

مرزا سودا فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور خان صاحب کے گلے سے لگ گئے اس شکریے کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقت میں خان صاحب نے ان کے کلام کو حدیث قدسی تسلیم کیا ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگرچہ سودا آرزو کے شاگرد نہ تھے لیکن آرزو کی صحبتوں سے بہت حد تک فیضیاب ہوتے تھے۔

میر درد | نام خواجہ میر اور درد تخلص تھا۔ ماں کی طرف سے
سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے
ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام محمد ناصر تھا، وہ بھی شاعر تھے، عندلیب
تخلص کرتے تھے اور شاہ گلشن سے نسبت ارادت رکھتے تھے اردو کا
بہت مختصر ہے ان کا فارسی غزلیات کا بھی ایک مختصر سا دیوان ان
ان کو موسیقی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ بڑے بڑے باکمال گانے
والے اپنی تخلیقات اصلاح کے لیے لاکر سنایا کرتے تھے۔ میر تقی میر
سودا اور مرزا مظہر جان جاناں ان کے ہم عصر تھے اور قیام الدین
قائم ان کے شاگرد۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ بھی آرزو
صحبتوں سے ضرور فیضیاب ہوئے ہوں گے کیونکہ ان کے ہمعصر شعرا جن
کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یا تو آرزو کے شاگرد رہے ہیں اور اپنا کلام
ان کے پاس اصلاح کے لیے لے جاتے رہے ہیں، یا ان کی صحبتوں سے
ضرور استفادہ کیا ہے اس لیے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے
درد بھی آرزو کی صحبتوں سے محروم نہ رہے ہوں گے۔

آرزو اپنے معاصرین کی نظر میں:

آرزو ایسے خوش نصیب ہیں جنھوں نے اپنے معاصرین سے
وافر داد تحسین وصول کی ہے۔ یہاں ان کے چند معاصرین کی ان
بارے میں رائے نقل کی جاتی ہے:

۱۔ محتشم علی خاں حشمت، کے ذیل میں "مجمع النفائس" میں نقل ہے

" استاد سراپا ارشاد"

۲۔ شاہ آفرین لاہوری کے ذیل میں "مجمع النفائس" میں درج ہے:
"امام سخنوراں"

۳۔ والہ داغستانی "ریاض الشعرا" میں لکھتے ہیں کہ امرا و وزراء مملکت ان کی عزت و حرمت میں کوشاں رہتے ہیں:
"امراء و اعاظم دولت پیوستہ در حرمت و مراعاتِ او اہتمام می ورزند"

۴۔ ابو حنیفہ کوفی کا خیال ہے کہ اگر خان آرزو کو ہندی شاعری کا باوا آدم کہا جائے تو بجا ہے:
"اگر شعرای ہندی زبان را عیال خانِ آرزو گویند می سزد"

۵۔ قدرت اللہ قاسم "مجموعہ نغز" میں خان آرزو کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:
"نسخہ پرداز ایہام گوی میان آبرو و سرآمد سخن سنجانِ خوشنوا میرزا محمد رفیع سودا، و مملکت سخن سازی را یکہ تاز مرد خواجہ میر درد، شاعر بی نظیر محمد تقی میر منجملہ فیض اندوزانِ آن گیہانِ خدیو سخن پردازی اند"

۶۔ میر تقی میر "نکات الشعراء" میں خان آرزو کی استادانہ استعداد کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:
"شاعر زبردست تا در سخن عالم فاضل تا حال ہمچو ایشاں بہ ہندوستان جنت نشان بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود . . . . حاصل کمالات او شان از حیز بیان بیرون است۔ ہمہ استادان مضبوط

فن ریختہ شاگرداں آں بزرگوارند"

۷۔ اسی طرح قایم چاندپوری "مخزن نکات" میں لکھتے ہیں:

"بالفعل در فضیلت و کمال فوقش منصور نیست حق تعالی سلامتش دارد و زیاد براین کمالات آں بزرگوار مثل من ہیچمداں چہ نویسد کہ شمار قطرہ آب باراں نمودن سیاحت افلاک پیمودن است"

۸۔ میر حسن "تذکرہ شعرای اردو" میں اظہار خیال کرتے ہیں:

"سرگروہ سخن سنجاں، استاد استاداں ..... بعد امیر خسرو چنین صاحب کمال پرگو و خوشگو بسامع عالمیاں نرسیدہ"

اسی طرح یہ بھی ایک عام خیال ہے کہ ذوق سخن، نقد سخن، شرح سخن اور فارسی زبان شناسی میں ایسا فاضل امیر خسرو سے آرزو کے زمانے تک ہند کی سرزمین میں کوئی دوسرا نہیں پیدا ہوا، ان کی تالیفات جو گوناگون موضوعات پر مشتمل ہیں ان کے دانش فضل اور دقت نظری کا بہترین نمونہ ہیں

ایرانیوں کی بے جا برتری: آرزو ہندستانی تھے اور انہوں نے فارسی زبان کے مزاج کو پوری طرح سمجھا تھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی پوری طرح سمجھے کہ یہ زبان ہندستان میں چھ سو برس سے رائج تھی اس لیے یہاں کے مزاج سے آشنا ہو چکی تھی۔ یہاں کے رسم و رواج، جغرافیائی اور تاریخی رجحانات اور لوگوں کے ذہنی رجحان

سے پوری طرح روشناس ہو جانے کے باعث بعض اعتبار سے ایرانی فارسی سے ممتاز اور اپنی جگہ اس کی اہمیت مسلم ہو چکی تھی۔

محمد شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں ہندو مسلم کا احساس اور سنّی و شیعہ جذبات نام کو بھی نہ تھے لیکن ایرانی و ہندستانی جھگڑے بہت جڑ پکڑ چکے تھے اور سوسائٹی پر ایرانی رنگ غالب تھا جس میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی آرزو نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندستان کی عام ادبی ذہنیت پر ایرانیوں کی بے جا برتری کا شدید احساس حاوی ہے جس نے ہندستانیوں کی اپنی ذہانت اور قوتِ تخلیق کے سوتے خشک کر دیے ہیں اور اب ہندستانیوں کے لیے کچھ نہیں ہے صرف ایرانیوں کی کورانہ تقلید کی جاتی ہے حالانکہ یہ چیز لسانیات کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے جب ایک ملک میں کسی دوسرے ملک کی زبان غلبہ پاتی ہے تو اس کے ملک کی اصل زبان کا یہ حق کسی طرح نہیں چھینا جا سکتا کہ معاشرے کی اہم ضرورتوں کے مطابق ایسے الفاظ کو اس زبان میں داخل کر لیا جائے جن کے بغیر عمومی زندگی کے مظاہر کے اسباب کم ہو جائیں مثلاً لفظ پان، فارسی زبان اس لفظ کی ان لطافتوں سے عاری ہے جو پان کے تصور سے ہمارے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کا ترجمہ "برگ تنبول" کر لیا جائے تو یہ ترجمہ لفظی حیثیت سے تو درست ہوگا مگر برگ کے لفظ میں جو تلخی کا تصور پایا جاتا ہے، وہ پان کے کچے پن کے باوجود اس میں چھپی ہوئی لطافت کا گلا گھونٹ دیتا ہے

اس لیے زبان کے لفظ کو اس کی اصلی صورت میں فارسی کے اندر داخل کرنے کا حق ہندستانی کو ملنا چاہیے اور کسی بھی ایرانی کے لیے ہندستانی کا یہ حق اتنا ہی مسلم ہو جتنا کہ کسی دوسرے فارسی کے لفظ پر ایرانی کا حق ہو سکتا ہے۔

آرزو پہلے ہندستانی ہیں جنھوں نے ایران نوازی کو ترک کر کے ہندستان کی تعریف اور ہندستانیوں کے رسوم وغیرہ کو جو اب تک ناقابل التفات سمجھے جاتے تھے واضح کیا، فارسی ادب اور اس کے استبداد کا ایوان جو اکبر کے زمانے سے مستحکم ہوا تھا آرزو کے زمانے تک قایم رہا چنانچہ ایرانیوں کی قدر و منزلت اس کے باوجود کہ وہ ہندستانیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کو برا بھلا کہتے تھے، اس وقت تک باقی تھی۔ ایرانی مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے اور زبان کے معاملے میں جاہل سے جاہل ایرانی بھی استناد و استشہاد میں پیش کیا جاتا تھا، اس سوسائٹی کا یکسر قلع قمع کرنا بہت مشکل بات تھی، اس ضمن میں آرزو کو عزم راسخ و استقلال سے کام لینا پڑا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے انھوں نے اپنے کو نمایاں کر کے بادشاہ کا تقرب حاصل کیا اور محمد شاہ کے دربار کے ملک الشعرا بنے ملک الشعرا بنتے ہی انھوں نے پہلے آنند رام مخلص کے ذریعہ اور پھر خود اس قسم کے خیالات کو مشتہر کیا، چنانچہ مثمر میں انھوں نے صاف صاف لکھا۔

"تصرف صاحب قدرتان ہند در فارسی چرا جائز نباشد"

اس وقت سے ان کی ہر بات سند مانی جانے لگی اور کلام پر سبحان اللہ کا شور مچنے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے شعر و ادب کی بنیا

ہندستانی چیزوں پر رکھی اور اپنے اشعار میں اکثر و بیشتر ہندی الفاظ استعمال کرنے لگے۔ اس طرح اپنے کمال فن اور استعداد سے ثابت کر دیا کہ ہندی کسی طرح ایرانیوں سے کم نہیں بلکہ استناد و استشہاد کے لیے ان سے بہتر ہیں کیونکہ بیدل و امیر خسرو کے تصرفات کو صحیح مان کر بیدل کی عظمت یوں قائم کی۔

"چون از راہ قدرت تصرفات نمایان در فارسی نمودہ مردم ولایت و کاسہ لیسان آنہا کہ از اہل ہند اند در کلام این بزرگوار سخن ہا دارند و فقیر در صحت تصرفات صاحب قدرتان ہند ہیچ سخن ندارد بلکہ قائل آن است"

آرزو کی اس کوشش نے ہندی فضلاء کی علمی کوششوں کو وقیع بنا دیا۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا۔ ہندستانی ارباب کمال کے علاوہ خود ایرانی اساتذہ بھی جو شاہی دربار سے وابستہ تھے ان کی باتوں اور دلائل پر قبول کی مہریں ثبت کرنے لگے اور آرزو درباری شعرا کے سرتاج بن گئے۔ جب ان کے فضل و کمال کا سکہ لوگوں پر بیٹھ چکا اور تلامذہ کی فوج تیار ہو چکی اس وقت اقلیم سخن کے اس فرمانروا نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اس کے حریف مقابل شیخ علی حزیں سے جنگ ٹھہری شیخ نے ایران نوازی اور اپنی عالی منصبی کے زعم اور ہندستانیوں سے نفرت کے جذبے میں دریدہ دہنیوں اور ہجو کو سپر بنایا۔ لیکن اب انقلاب کی زمین تیار ہو چکی تھی اس لیے لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ کشمیریوں نے ہجو کشمیر کا بدلہ لیا۔ ثبات نے اپنے باپ کی ذلت کے انتقام میں حزیں کے دیوان

سے تقریباً پانچسو ایسے اشعار نکالے جن کے مضامین شعرائے متقدم کے کلام سے ماخوذ تھے۔ امرا شیخ کے پہلے سے ہی دشمن تھے آرزو بھی ان کی گالیوں کا نشانہ بن چکے تھے، چنانچہ انہوں نے بھی حزین پر "تنبیہہ الغافلین" لکھ ڈالی جس میں شیخ کے تقریباً چار سو اشعار پر نکتہ چینی کی اور یہ اعتراضات اپنے تلامذہ کو زبانی یاد کرائے شیخ جہاں جاتے وہ اعتراضات سنائے جاتے۔ شیخ بگڑتے، گالیاں دیتے۔ یہ چیز آرزو کے مقصد کے حصول کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی اور ہندستانیوں میں ایرانیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا بڑھا کہ شیخ کا دہلی میں رہنا دشوار ہوگیا اور وہ وہاں سے نکل گئے۔ ایک ہندستانی نژاد کا یہ دلیرانہ اقدام اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ لوگوں کی نظر میں ایرانیوں کی جہالت، ہندستان سے ان کی نفرت، ان کے سرقوں اور مبلغ علم کا پردہ فاش ہوگیا اور روز بروز ان کی قدر و منزلت لوگوں کی نگاہوں سے گرنے لگی۔

دوسری طرف آرزو نے یہ تدبیر کی کہ ایرانی اساتذہ مثلاً عرفی، ظہوری، طالب آملی، زلالی خوانساری اور مرزا صائب وغیرہ کے کمالات کا اعتراف کر کے اپنی بے تعصبی ظاہر کی مثلاً ملا منیر لاہوری کا جواب لکھا اور سراج منیر لکھ کر ایرانی اساتذہ کی اہمیت واضح کی۔ قدسی کی استادی پر داد سخن دی۔ تذکرہ مدون کر کے ہندستانیوں کی ادبیت و شعریت کو ظاہر کیا۔ ان تمام تصانیف میں آرزو نے جذبات و ذاتیات کے بجائے اصول کو مدنظر رکھا۔ ان کی جنگ اگرچہ حزین سے تھی لیکن اس سلسلے میں انہوں نے ایرانیوں کے نقائص

اور سقم کو ظاہر کر کے جنگ کو عالمگیر بنا دیا۔ مثنر ہیں ہندی، لاطینی، یونانی اور عربی زبان میں ایرانیوں کے تصرفات، ایران کے مختلف خطوں میں تلفظ کا اختلاف، ان کے یہاں ہندی الفاظ کا استعمال دکھا کر ہندی کا فارسی زبان میں تصرف جائز قرار دیا اور اس کام کی تکمیل آنندرام مخلص سے کرائی۔ مخلص کو شاعری میں محض "برابر فکر او کسی در ہندو نیست" کی سند حاصل نہیں تھی بلکہ ان کی افتاد طبیعت کچھ ایسی تھی کہ وہ عجائب و غرائب کو بہت پسند کرتے تھے، زبان دانی کے مدعی اہل زبان سے برابر مقابلہ کیا کرتے تھے، ادبی محفلوں میں اہل ایران کے ساتھ حریفانہ گفتگو کرتے اور ان کے کلام پر تنقید کر کے ہندستانیوں کے کلام کو قابل استناد ثابت کرتے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت فارسی زبان بھی انحطاط کا شکار ہوئی۔ انشا پردازی میں مختلف قسم کی بحثیں و تنازعے پیدا ہو چکے تھے اسی میں ایک تنازعہ "استعمال الفاظ ہندی در فارسی" کا تھا ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہندی الفاظ کی آمیزش فصاحت میں فرق پیدا کر دیتی ہے، اور دوسری جماعت کا یہ دعویٰ تھا کہ جب ترکی، تورانی عربی وغیرہ کے ملاپ سے فارسی میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی تو ہندی جو فارسی کی ہم شل ہے کیوں اس قابل شمار نہیں کی جاتی۔ اس گروہ کے امام آرزو تھے اور مخلص ان کے پیرو۔ آنندرام مخلص نے آرزو کے ایما سے ہی ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں ہر حیثیت سے ہندستانیوں کی فضیلت دکھاتے ہوئے فارسی میں ہندی الفاظ کا استعمال جائز قرار دیا۔ مراۃ الاصطلاح میں ایک مقام پر لکھتے ہیں؛

وہ اعتقاد بر عزیزان است کہ الفاظ ہندی در فارسی
آوردن نبست ...... این چیزہا برای خانان ومبتدیان
مضایقہ دارد، اہل قدرت واستعداد مختار اند"
اسی طرح کا خیال چمنستان میں ظاہر کیا ہے کہ فارسی میں ہندی
الفاظ کا استعمال نادر الکلام لوگوں کے لیئے جائز ہے۔ آرزو
نے بھی سیکڑوں جگہ مثمر، مجمع النفایس، چراغ ہدایت، سراج اللغۃ
وغیرہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے مخلص اور آرزو کی کوششوں کا یہ نتیجہ
ہوا کہ وارستہ سیالکوٹی اور آزاد بلگرامی کی "ایران پسندی" کے باوجو
فضلا کے ایک بڑے حصے نے آرزو کا ساتھ دیا اور ایران کی فضیلت ا
اس کے استبداد کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ مجمع النفایس سے یہ معلوم ہوتا
ہے کہ جنگ کی اصل بنیاد کیا تھی، اورانھوں نے کیونکر ایرانی وہندستانی
نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ ایرانیوں کے متکبرانہ برتاؤ کے لئے لکھتے ہیں

"بنازم انصاف مرزا صاحب مرحوم را والا فلقچیان جاہل
ایران وصاحبان گنج باد آورد کلام ہندی را بخاطر
نمی آرند"

آرزو کی طبیعت میں قدرت نے جدت طرازی، شوخی وظرافت
اور معقول پسندی کا ایسا مادہ ودیعت کیا تھا جس کے سبب وہ
ہمیشہ ایرانیوں پر غالب اور ان کے اصل رنگ وروپ کو ہمارے
سامنے پیش کرتے رہے۔ ان کا طریقہ تھا کہ جب وہ کسی ایرانی کو فاش
غلطی کرتے ہوئے دیکھتے تو اس کی رائے سے اتفاق کرتے، پھر ان غلطیوں
تنقید کرکے اسے احمق ثابت کرتے۔ ایک ایرانی شاعر تازگی نے دجس ک

ذکر مجمع النفائس میں ہے) بکثرت غلطیاں کی ہیں، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"فقیر گوید احوالی زباندان چنین باشد وائے بحال مردم شعرای ملک دیگر کہ بفارسی سخن رانند، درین صورت اگر ہزار غلط از ہندی واقع شود برابر یک غلط اہل زبان نہ بود"

آرزو نے اساتذہ کی موافقت کرکے، ان پر اعتراض کرکے، اُن پر نقد و جراح کرکے، خود اپنی فروگذاشتوں کو واضح کرکے ایرانی شعرا کا جس جس انداز میں مذاق اڑایا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی ہندستانیوں کی نظر سے گر گئے اور آرزو کی اس کوشش نے سوسائٹی کا رنگ بدل دیا اور یہ بات ثابت کردی کہ ہندستانی کسی حیثیت سے بھی ایرانی اہل زبان سے کم نہیں ہیں۔ یہ شرف اور امتیاز صرف آرزو کو حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے علم و کمال کو اپنے ملک و قوم کی سربلندی کے لیے صرف کیا جس سے فیضی اور ابوالفضل جیسی ہستیاں بھی محروم رہیں۔ ان کے یہاں وہی درباداری اور خاکہ کشی ہے۔ اس کے برخلاف آرزو کے یہاں اور چیزوں کے ساتھ انسانیت ہے۔ ہندستان کو وہ اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ اپنی پرانی تہذیب کو مقبول بنانے میں سرگرداں رہتے ہیں، اپنی شاعری اور ادب کو ہندستانیوں کی عزت و وقار میں صرف کرتے ہیں اور اپنی تحریروں سے ایرانی کبر و نخوت و غرور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔

ذاتی طور پر آرزو پاک مشرب، بے ریا، مہذب، زندہ دل،

یار باش، متواضع، منکسر اور باد قار انسان تھے۔ وہ محمد شاہ کے دربار میں جس منصب پر فائز تھے اس کے اعتبار سے ان کو عوام سے میل جول کم رکھنا تھا لیکن اس کے برعکس اگر ایک طرف محمد شاہ اور اسحٰق خان شوشتری سے ان کی صحبتیں رہیں تو دوسری طرف وہ اپنے تلامذہ اور عوام سے بھی اسی طرح ملتے تھے۔ عجز و انکسار کا یہ عالم کہ ہر جگہ اپنے کو حقیر، عاصی، ناچیز، عصیان شعار اور خاکسار وغیرہ کے علاوہ کوئی فخریہ لفظ استعمال نہیں کرتے، اپنی تحریروں کو حقیر بتاتے ہیں، گو ان کا درجہ اساتذہ کا تھا لیکن ہر جگہ اپنے کو ناقص ہی لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقتدایان فن کے گردِ قدم تک بھی نہیں پہنچ سکتا ہوں۔

آرزو کی زندگی کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جیسے لوگ دنیا میں قسمت کے ہاتھوں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے ہی پیدا نہیں کیے جاتے بلکہ خدا ان کو امتحان کے بعد عزّت اور بزرگی کی مسند پر بھی بٹھاتا ہے۔

آرزو پایے کے مصنف تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات اردو، فارسی شاعری، قواعد، لغت اور لسانیات وغیرہ پر بہترین کتابیں لکھیں۔ اپنی کتاب عطیۂ کبریٰ میں (۱۱۴۷ھ/۳۴-۱۷۳۳ء) وہ اپنی سولہ تصانیف کی فہرست دیتے ہیں، مجمع النفائس میں (۱۱۶۴ھ/۵۱-۱۷۵۰ء) ان کی تیرہ تصانیف کا تذکرہ ہے جن میں سے آٹھ وہ ہیں جو عطیۂ کبریٰ کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ بہرحال بی۔اے۔ اسلودی اور منوہر سہائے انور نے ان کی کتابوں کی تقریباً مکمل فہرست دی ہے

اب ہم ان کو سلسلے وار بیان کرتے ہیں

شاعری:

آرزو اپنے بیشتر معاصر شعرا کی طرح اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعرانہ استعداد کا اعتراف خود ان کے معاصر اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اساتذہ کے وہ اقوال جو ان کی شاعری کے سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ فتح علی گردیزی کہتے ہیں کہ آرزو کا قلم ادب کی بادشاہت میں حکومت کرتا تھا۔ اور ان کی فنی مہارت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا تھا۔

۲۔ حسین دوست سنبھلی کا خیال ہے کہ آرزو شاعر اور عالم کی حیثیت سے اپنی فنی اور علمی مہارت کے لیے ایک مضبوط ستون تھے۔

۳۔ قیام الدین قائم کہتے ہیں کہ آج کل کے زمانے میں ان سے بہتر شاعر اور عالم کا تصور ناممکن ہے۔

آرزو کی اردو شاعری:

آرزو نے اردو میں شعر لکھ کر اور اپنے شاگردوں کو اردو شاعری کی طرف توجہ دلا کر اردو کا وقار بڑھایا، اسی ضمن میں محمد حسین لکھتے ہیں:

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے، جب تک کہ کل منطقی

ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو
کے عیال کہلاتے رہیں گے. ان کا دلچسپ حال قابل تحریر
تھا لیکن چونکہ فارسی تصنیفات کی مہموں نے انہیں کوئی
اردو میں دیوان نہیں لکھنے دیا. خان آرزو وہی شخص ہیں
جن کے دامن تربیت سے ایسے شایستہ فرزند تربیت پاکر
اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے
اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی
اسے کھینچ کر فارسی کے طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے
یعنی مرزا جانِ جاناں مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر،
خواجہ میر درد وغیرہ" (۱)

آرزو کا کلام اردو شاعری کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے ایک اور
تاریخی دستاویز ہے. ان کے کلام سے اس دور میں جو محاورات استعمال
ہوتے تھے ان کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے. قائم چاندپوری نے
"مخزن نکات" میں ان کے پانچ شعر لکھے ہیں جن میں سے تین وہی ہیں جو
میر نے لکھے ہیں. گردیزی نے "تذکرہ گردیزی" میں آٹھ شعر دیے ہیں
علی لطف نے "گلشن ہند" میں البتہ دو پوری غزلیں لکھی ہیں. بعض
دوسرے تذکروں میں بھی کچھ جستہ جستہ اشعار ملتے ہیں جو ذیل میں نقل
کیے جا رہے ہیں:

بعدے تجھے سب خلاف جو اس لب سے ہم سنے
یہ لعل قیمتی دکھو جھوٹا نکل گیا

۱/ ر ر

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے[۱]

مرے شورِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو
بہارِ حسن کو دی آب جب اس نے چرس کھینچی[۲]

مے خانے بیچ جاکر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

دریا عرق میں ڈوبا تجھ سیم تن کے آگے
موتی نے کان پکڑا تیرے سخن کے آگے

ہرگز نظر نہ آیا ہم کو سخن ہمارا گویا کہ تھا چھلاوہ من ہرملن ہمارا

تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے
غنچے نے گانٹھ باندھا سنکر سخن ہمارا

جان پر کچھ نجھ پر اعتماد نہیں زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

---

(۱) آبِ حیات۔ ص ۱۴۹
(۲) ایضاً

آتا ہے صبح اُٹھ[1] کر تیری برابری کو کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
اس تند خو صنم سے جب سے لگا ہوں ملنے ہر کوئی جانتا ہے میری دلاوری کو

کھول کر بندِ[2] قبا کو ملک دل غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں کیا[3]

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بے کار رہے اٹک[4] نہ رہے دل تو کیا کرے

دریائے اشک اپنا جب سر پہ اوج مارے
طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے

مغان مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

اس زلفِ سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے[5]

آرزو کے درج ذیل اردو شعر کی وجہ نزول اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے

---

(۱) آب حیات ص ۹۴،۱ (۲) ایضاً: بزرِ قبا (۳) ایضاً: لیا (۴) لٹک (۵) ایضاً

سودا نے اپنے تذکرے میں اس شعر کو آرزو کے نام سے اس طرح لکھا ہے اور سید لشاہ اللہ خان نے اپنی کتاب "دریائے لطافت" میں قزلباش خاں اُمید کے نام پر اس شعر کو اس طرح لکھا ہے: از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے۔ درخانۂ آئینہ گتا جوم بری ہے اور بعض تذکروں میں (اس شعر کو مرزا مظہر کے نام سے لکھا گیا ہے)، واللہ اعلم۔

دو شاگردوں میں ایک نوجوان بچپن سے حاضر رہتا تھا،
حسن اتفاق یہ کہ چہرہ اس کا نمک حسن سے نمکین تھا وہ
کسی سبب سے چند روز نہ آیا۔ ایک دن یہ سر راہ بیٹھے
تھے کہ وہ ادھر سے گزرا۔ انہوں نے بلایا، شاید
اسے ضروری کام تھا کہ وہ عذر کر کے چلا گیا انہوں نے
پھر روکا اور بلا کر یہ شعر پڑھا

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے[۱۴]

آرزو کی فارسی شاعری :

شاعری کی صلاحیت آرزو کو قدرت نے عطا کی تھی اور جیسا کہ
ایک دانشور سے توقع کی جا سکتی ہے وہ اس خوبی پر پورے اترتے
تھے۔ ان کا انداز بیان، طرز گفتگو اور شاعرانہ خیالات ان کی
انفرادیت کے شاہد ہیں۔ انہوں نے نہایت خوبصورت اور ظریف
زبان میں شاعری کے لباس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کو
غزل، رباعی، مثنوی، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند اور مقطعات
وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ ان اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی
کی اور ایسے کارنامے دکھائے جو آج تک یادگار ہیں۔ ان کی غزلیں
سلیس اور سادہ الفاظ میں فصاحت کمال کا مرقع ہیں اور ندرت
خیال اور آرائش جمال، واردات عشق و معاملات محبت میں بے مثل
ہیں جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے انہوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ
اگر در حقیقت پھر ہندوستانی شعرا کے کلام سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو

وہ ان کے پایہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جہاں تک جواب گوئی کا تعلق ہے نہایت فخر سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جو دیوان دوسرے شعرا کی تقلید میں لکھے وہ حقیقت پر مبنی ہیں اور کوئی شاعر ان کی برابری نہیں کر سکتا ہے۔

خان آرزو بحیثیت غزل گو

آرزو نے بڑی تعداد میں غزلیں لکھی ہیں، یہ غزلیات آرزو کی فنی مہارت پر دال ہیں، مضامین کے لحاظ سے ان میں تنوع نظر آتا۔ زبان اور بیان کی خوبیاں ان غزلیات کا خاصہ ہیں۔ ان کی غزلیں جذبات نگاری و شیوا بیانی کا لطیف ترین نمونہ ہیں۔ انہوں نے دلکش معانی کو سلیس اور سادہ الفاظ میں فصاحت و کمال کا مرقع بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور فارسی ادب میں ایسی روایات قائم کر دی ہیں جن کی بدولت غزل نے تہذیب و شایستگی اور ترجمانی کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ہمارے ادب میں روح حیات و نشاط سرمدی بنکر ہر طرف چھا گئی۔ وہ بات کو مفصل بیان کرنا بھی جانتے ہیں اور مختصر کر کے کہنا بھی۔ انہوں نے غزل کے معیار کو بلند کیا عشق کے بیان میں معاملہ بندی وغیرہ کو شامل رکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں میں لاشعوری طور پر چھپے ہوئے جذبات و تاثرات کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے غزل کو سوز دل اور غم الفت دونوں کی صحیح طور پر ترجمان بنانے کی کوشش کی۔ یہاں بھی زبان کی سادگی و بے تکلفی کے باوجود انداز بیان کی نزاکت و دلکشی میں کمی نہیں آنے پاتی، انہوں نے سنگ ریزوں کو ترتیب دیکر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما

وگراں بہا بنا دیا۔ ان کی غزلوں کے کچھ پسندیدہ اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں :۔

قیامتم بسر آوردۂ پس از مردن　　　دگر ز جای من ای آسمان چہ می خواہی

محتسب از سخت جانی نی دلم تنہا شکست
شیشہ را گردن، سبو را دست، خم را پا شکست

چشم بد دور عجب کافر بی ساختہ است
ہندوی زلف ترا قشقہ بہ پیشانی نیست

بحیثیت قصیدہ نگار :

قصیدہ نگاری میں آرزو فارسی کے اساتذہ شعرا کے پیروکار نظر آتے ہیں، ان کے قصائد اپنے پرشکوہ انداز بیان اور رفعت تخیل کے لیے مشہور ہیں۔ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں دہلی میں آگ لگی اور لوگوں نے جمنا کے پانی کو کھول کر اس سے نجات پائی آرزو نے ایک قصیدہ لکھا، جس کے گریز میں نعت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ قصیدہ کی چند بیت ملاحظہ ہوں :۔

بدہلی آں ہمہ آتش فتادہ است امثال
کہ شد چو بوتہ حداد شہر پر ز زکال
ز اشتعال ہوا شعلہ بر کشیدہ سری
چنان بہ چرخ کہ در آتش است مغل ھلال

رسد به خانۂ دلہا اگر حرارت آن
شوند آبلہ رو جملہ شاہدانِ خیال
بعید نیست ز بیم فتادن آتش
کشد ز خانۂ آئینہ پا اگر تمثال
کنند غرقۂ طوفان نوح اگر عالم
فرو نشستن آن ہست پیش عقل محال
مگر بداد رسد ابرِ رحمت ایزد
شفیع ہر دو جہان خواجۂ اللہ خصال
محمد عربی پادشاہ دریا دل
کہ سبز کردۂ او ہست کشتۂ مہ و سال
چہ جای آتش دنیا کہ از توجہ او
تمام آتش دوزخ شود فسردہ زگال

اس کے بعد براق کی تعریف میں لکھتے ہیں:

قمر میان کواکب بود سریع السیر
بدان جہت کہ مشابہ بہ نعل اوست ہلال
بجست و خیز فلک را ز جای خود بر داشت
چو بیضۂ کہ ز شبنم بر آورد پر و بال
بہ بی نظیری او از مصور قدرت
کسی قبول ندارد تحیر دامثال
کشد مصور اگر صورتش ز شوخیہا
بنوک خامہ بر قصد خبہ تا سہ سال

آرزو کا ایک اور قصیدہ محمد شاہ کی شان میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

چہ موسم است کہ گل گل شگفتہ عارض یار
زنشاۂ گلگوں برنگ صبح بہار

زپرتو رخِ تابان ساقیم نشاء
زموج بادہ بہ برکردہ جامۂ زرتار

چنیں کہ جبۂ اوگل فشانِ انوار است
زخاک درگہ شاہی بران فتادہ غبار

چہ در درشۂ جمشید فر محمد شاہ
کہ ہست درکفِ حکمش عنان لیل و نہار

کند ضیافت اعداش را اگر
سپہر قاشق شربت کند ز کفچۂ مار

شکار کے وصف میں کہتے ہیں:

تما غہ اش کہ بود رشک تاج کیخسرو
سرش فرو دنیاید بگنبد دوار

تفنگ شاہ کہ از دردیست دشمن سوز
دران نفس کہ شود ہمچو برق آتش بار

زبکہ جذب رطوبت ز طبع دہر کند
شود چون بحر کماں خشک ابر در تاتار

نعتیہ قصاید

آرزو کے نعتیہ قصاید بھی قابل توجہ ہیں، ان قصاید سے شعائر
اسلامی سے ان کی والہانہ وابستگی کا اظہار ہوتا ہے:

باشد از عکس ریاحین عالمگیر در آب
بیضۂ الوان نوروز است ہر گوہر در آب
بسکہ رنگ تازہ گلہای بہاری ریختند
چتر طاؤس است گوئی برگ نیلوفر در آب
از چمن پیرائی ابر بہاری دور نیست
گر حباب و موج گردد سنبل و عبہر در آب

ایک اور نعت کے دو شعر درج ذیل ہیں:

ای محمد مرسل ای امیر لولاک برگرد سر کو یتو گردد افلاک
منظور خدا بود ز بس رفعت تو برداشتہ است سایہ ات را از

آرزو کے مخمس بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارے اس
شاعر نے ملا وحشی یزدی کی ایک غزل کی تضمین کی اور اپنے ہا
سے سفینۂ خوشگو میں نقل کے لیے خوشگو کو بھیجا تاکہ عزیزوں ا
دوستوں کے لیے یادگار رہے۔ مخمس یہ ہے:

تو بر کنم کہ از تو پیامی مرا بس است
از باغ وصل جلوۂ غامی مرا بس است
ور بشنوم ز درد کلامی مرا بس است
از تو ہمین تواضع عامی مرا بس است
در ہفتہ جواب سلامی مرا بس است

عمری اگرچہ داشتہ ام حسبِ جاہ قرب — می بینیم از عداوت دوری پناہ قرب
اکنون چو یافتم کہ بود صعب راہ قرب — نی صدرِ وصل خواہم و نی پیشگاہ قرب
ہمراہی تو یک دو سہ گامی مرا بس است

ہر چند العطش زدہ ام بہرِ آب وصل — گردیدہ ام با تشِ حسرت کبابِ وصل
قانع بہ جلوۂ شدہ ام از حجابِ وصل — خمخانۂ نمی طلبم از شراب وصل
یک قطرہ باز ماندۂ جامی مرا بس است

چون نقش پا فتادہ گہی در رہ تو ام — حیراں برنگ ہالہ دمی بر مہ تو ام
دیدار جو گدای درِ خرگہ تو ام — بیہودہ گرد عرصۂ جولانگۂ تو ام
گاہی کرشمہ گاہی خرامی مرا بس است

ای نرگس تو از مژہ گردید کجکلاہ — من بندہ ات بدعوی من آرزو گواہ
مگذار کار من ز تغافل شود تباہ — وحشی بگو بگو سگ کو بلکہ خاکِ راہ
یعنی ز تو نوازشِ نامی مرا بس است

خان آرزو کے شعری کلام کے مجموعے حسب ذیل ہیں:

کلیات

جیسا کہ آرزو نے مجمع النفائس میں ذکر کیا ہے کہ ان کی کلیات میں تقریباً تیس ہزار اشعار شامل ہیں۔ بانکی پور میں جو کلیات موجود ہے وہ اسی جملے سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ سپرنگر صفحہ ۱۰۷ میں ہے: "انتخاب از دیوانِ آرزو" کلیات آرزو کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

قطرہ را دعوئی انا البحر است — چون نفہمد حقیقتِ دریا

صحبت ارباب دنیا نیست جز نقص تمام ۔ کم بود زین وجہ قیمت جامۂ پوشیدہ را

بحرف و صوت می جوئی عبث سرمایۂ عزت
معما جز خموشی نیست این جا اسم اعظم را

ندارد یاد ایام جدائی چشم مست او
حسابی نیست در پیش فرنگی سال ہجرت را

بیدغای پیش نتوان برد در شطرنج دہر
گاہ چپ گہ راست رفتن ہست لازم شاہ را

تا ابر رحمت خوشتر نماید فی المحشر یا قوم تو مواسکاری

فریبا خوش لپران خوردن آرزو ستم است
زروی تجربہ گفت این سخن پدر ما را

دلم بذوق اسیری در آشیان خون شد
شود شناختہ نعمت دمی کہ مفقود است

یارب زیادہ زین نہ پسندی خرابیش
مسکین دل منست دیار فرنگ نیست

شکسته پا بنشین آرزو بگوشهٔ فقر — که شاه مملکت فقر چون تو لنگ است

قسمتِ ما و توای ناصح بجنت هم جداست
تشتهی الانفس ترا، ما را تلذ الاعین است

آرزو از مردم دنیا که کمتر از زنند — چشم پوشیدن ترا او جب چو ستر عورت است

محزون بعیش و شاد بغم باشم آرزو — نیک و بد زمانه چو بر یک قرار نیست

گدای میکده دارد چه همت عالی — که بادشاه جهان است و جبا هش نیست

شیخ حرم بد است، پیر مغان بسجد — دیدیم آرزو را بسیار لاابالیست

نکنم توبه که از پیر مغان دارم شرم — هر کجا رسم حیا نیست مسلمانی نیست

زاهد را گرفته بدردی می عسس — امشب بکوی میکده غوغای دیگر است

کو آنکه نگشته فکر نانش — خلق از پی زیستن هلاکست

به همین عشق تو مقبول عالمی شده ام — کدام دل که دراو آرزو جای تو نیست

تحجبر دہر کہ دارد شاہ ہفت اقلیم می گردد
زمین آزردہ را تحت و فلک دیہیم می گردد

کہ دیدہ است بااین رنگ و جوشِ کیفیت
تو بادہ خوردی و در اہل بزم ہوش نماند

حسود پست شد آنجا کہ بیت خود خواندم
چنانکہ بر سرکس خانۂ فرود آید

ہمہ کامل نبورانی رخ دلبر نمی ماند۔ اگر ماند شبی ماند شبی دیگر نمی ماند

بود مشکل گرانسان نسخہ جامع بدست اُفتد
کند تا آدمی پیدا فلک بسیار می گردد

تند و پر شور و سیہ مست زکہسار آمد میکشان مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

ہزار سیل روان در رکاب اشک منست
بایں شکوہ درین دشت گریہ نتوان کرد

بکام اہل دول چندی می توان بودن
خوشا کسی کہ چو گردون زمانہ ساز بود

دیار آدمیت را رہ و رسم دگر باشد
کہ جز خوشنودی منعم دران سائل نمی خواہد

کی بود سیاح دہلی را تمنای دگر
ہست در ہر گوشۂ این شہر دنیای دگر

شب آرزو بیاد جوانی گریستم   دامن بر و کشیدہ ز ریش سفید خویش

پاس آداب شریعت نیست در سودای عشق
آرزو زلیخا شو شریک غالب یعقوب باش

نفہمد آرزو در دہر جز صاحب کمال این را
کہ چون بیت الغزل من خلوتی در انجمن دارم

کلیات کا جو نسخہ رامپور میں دستیاب ہے وہ ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں سب غزلیں ہیں یعنی مستقل اور جوابی دونوں: چوبیس قصیدے، ترکیب بند، ترجیع بند، خمسے، چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور متفرقات: بانکی پور میں جو نسخہ ملتا ہے اس میں ۱۱۴۰ھ/۱۷۶۱ء میں اس پر نظر ثانی کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ذخیرہ حبیب گنج فارسی ۴۷/۷۷، دانش گاہ علی گڑھ کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔

دواوین ۱۔ دیوان شفیعائی اثر شیرازی کے دیوان کے طرز پر جو کہ اس زمانے میں ہندستان میں بہت زیادہ مشہور تھا۔ اس کے نسخہ ذخیرہ حبیب گنج اور کتب خانہ دانش گاہ علی گڑھ میں بھی موجود ہے۔

ب۔ دیوان۔ سلیم تہرانی کے دیوان کے طرز پر

ج۔ دیوان۔ بابا فغانی شیرازی کے دیوان کے طرز پر

د۔ دیوان کمال خجندی کے دیوان کے طرز پر۔ شاعر اس دیوان کو صرف دال تک ہی لکھ سکا۔

۳۔ قصیدہ و رباعیات و مخمسات، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ

۴۔ **مثنویات:**

ا۔ جوش و خروش:۔ ملا نوعی کی سوز و گداز کے جواب ہیں۔

ب۔ شور عشق: زلالی کی مثنوی محمود و ایاز کے طرز پر تمثیلی حکایت ہے۔ اس میں چار ہزار ابیات شامل ہیں (۱)

پیرمردی کہ قدرت داشت سودا	ببازار حلب شد بہر سودا
ہجوم آئینہ در ہر طرف دید	گل حیرانی از دیدار خود چید
شگفت آمد چنان از دولت عکس	کہ خود را کرد گم در کثرت عکس
گرفتش در بغل بیطاقتی تنگ	چنین زد بیخودی میناش بر سنگ
کہ ای دکان بصد خوبی کشادہ	ہمہ عرض متاع حسن دادہ
چہ مصراست اینکہ رو فروشند	زیوسف بہتری ہر سو فروشند

(۱) مجمع النفائس (خدا بخش لائبریری)

جوانش داد مرد رمز دانی	چو عقل پیر در پیری جوانی
که اینها گرمی هنگامۂ تست	ہزاران یوسف اندر جامۂ تست

اس کا انتخاب سفینہ عشرت میں موجود ہے

ج۔ عالم آب: ظہوری کے ساقی نامہ کے جواب میں جو احمد نگر کے برہان نظام شاہ ثانی کے لیے لکھی تھی۔ اس کا انتخاب صحف ابراہیم میں درج ہے۔

د۔ مہر و ماہ: یہ ایسی بحر میں ہے جو کہ عام طور پر مثنوی میں نہیں ہوتی ہے۔ یعنی بحر غیر متعارف[1]

آدم گل باغست جہان	شیطان باشد نافرمان
راست براست رقم کردم	شاخ سرو قلم کردم

اس کا نسخہ دانش گاہ پنجاب میں ہے، اس میں چودہ ورق ہیں، مہر و وفا کے نام سے اس مثنوی کے دو نسخے رامپور میں ہیں، فہرست قلمی شمارہ ۴۳۲۷، ۴۳۲۸

عبرت فسانہ: ایک نامکمل نظم علی قلی سلیم کی قضا و قدر کے جواب میں ہے یہ حدیقہ سنائی کی بحر میں ہے۔

۵۔ رباعی:

آرزو نے جہاں اور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے وہیں رباعی کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے بہت سی رباعیاں لکھی ہیں، مثال کے طور پر دو رباعیاں یہاں پیش کی جا رہی ہیں:۔

---

(۱) مجمع النفائس (خدا بخش لائبریری)

در خدمت بادشاہ چندین جمشید — دامن بہ میان برزدہ از دوی امید
بنشست شہنشاہِ سکندر طالع — بر تخت رواں آئینہ چون خورشید

زمین مژدہ عافیت کہ از دوست رسید
شور شکرم بکابل و خوست رسید
باغ بلبل شدہ است خوشگوئی من
تا نامہ ز یار من کہ خوشگوست رسید

لغت نویسی :

لغت نویسی میں آرزو کے پایے کو پہنچنا مشکل ہے۔ وہ لغت نویس جو ان سے پہلے اپنی تمام عمر اس کام میں صرف کر چکے تھے، ان کی تصانیف آرزو کے سامنے پھیکی، بے معنی اور کم درجہ کی تھی۔ آرزو شاعر، نقاد اور عالم زبان ہونے کی وجہ سے ان لوگوں پر سبقت لے گئے تھے، ان کی تحقیق، شرحوں اور لفظوں کی تنقید و ترجمانی سے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسلاف کی معتبر معلومات کی طرف توجہ کرنا تضیع اوقات ہی ہو گا۔ انہوں نے کئی فرہنگیں ترتیب دیں۔ سراج اللغات، چراغ ہدایت فارسی میں اور نوادر الالفاظ اردو میں بہت مشہور ہیں۔

سراج اللغة

یہ بہت اہم اور ضخیم لغت ہے اور تقریباً چالیس ہزار قدیم فارسی کے لفظوں پر مشتمل ہے[1]۔

---

(۱) سراج بہت ضخیم لغت ہے۔ اس میں برہان قاطع کے الفاظ کو اپنی تنقید کے ساتھ شامل کیا ہے۔ ہلالکین ص ۲۵-۲۷

.... یہ لغت ان کے لیے جو قدیم فارسی شعرا کو پڑھنا
چاہتے ہیں، بہت اہم ہے۔ ٹیک چند بہار اس کتاب سے بہت
متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس سے بہار عجم میں استفادہ کیا ہے اسکی
تکمیل کے پیش نظر آرزو کا بنیادی مقصد فرہنگ رشیدی اور
برہانِ قاطع کی غلطیوں کی تصحیح کرنا تھا۔ یہ اس کتاب کی سب سے
اہم خوبی ہے اس میں فارسی اور سنسکرت زبان میں بہت مشابہت
بتائی ہے۔ اس سے پہلے قدیم فارسی کے لیے تین مکمل فرہنگیں؛
فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور سروری موجود تھیں اور
کسی دوسری فرہنگ کی اس موضوع پر ضرورت نہ تھی لیکن آرزو
دانشور عالم تھے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان تینوں فرہنگوں کی ترتیب
میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تینوں فرہنگیں زیادہ
مقبول و متداول نہیں ہوئیں لیکن ان کے برخلاف برہان قاطع دو تین
بار شائع ہوئی اور بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کی شہرت اور
مقبولیت اس بات پر منحصر ہے کہ یہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب
ہوئی ہے جس کی وجہ سے الفاظ کی شناخت اور اس کے معنی تک
جلد پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود برہان قاطع بھی تصحیفات
الفاظ اور معنی کے سلسلے سے اغلاط سے بھری ہوئی ہے۔ اور فارسی
ادب کے لیے ہرج مرج کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرزو نے
ایک ایسی فرہنگ کی ضرورت محسوس کی جو ان اغلاط سے یکسر پاک ہو
اس طرح ۱۱۴۷ھ / ۱۷۳۴ء میں آرزو کی انتھک کوششوں اور فرہنگ
رشیدی اور برہان قاطع کی مدد سے یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس میں

فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس، فرہنگ موئنسی، فرہنگ قوسی، موید الفضلا اور درر غرر، سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان فرہنگوں میں سے فرہنگ مو اور فرہنگ قوسی کمیاب ہیں اور اکثر لغت نویسوں نے ان سے استفا کیا ہے۔ اگرچہ آرزو کے ماخذ کم معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ محض جہانگیر کو لیجئے تو اس میں ترپن (۵۳) فرہنگوں سے استفادہ ہوا ہے۔ لیک نتیجہ کے اعتبار سے وہ خاصے کامیاب ہیں، انہوں نے اس فرہنگ میں جن مسائل پر بحث کی ہے وہ نہایت درجہ ناقدانہ ہیں، ان سے مصنف کے فن لغت میں غیر معمولی بصیرت کا پتا چلتا ہے۔ لغات کے علاو مصنف نے اور دوسرے فارسی متنوں سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن ان کی فہرست زیادہ طویل نہیں۔ .. ماخذ کی کمی کے باو اس کتاب کی ترتیب میں آرزو کی فنی مہارت کا بدرجہ اتم ثبوت ملتا ہے۔ یہ لغت مغربی طرز پر الفبائی اعتبار سے ترتیب دی گئی اس کے پہلے حرف کو باب اور دوسرے حرف کو فصل کہا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب باوجود اپنی خوبیوں کے بہت زیادہ عام ہوسکی ہے۔ اس لیے کہ اس کے نسخہ کثرت سے نہیں ملتے ہیں اور غالب یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی ہے ترجمہ سروری کے ضمن میں جو عہد جہانگری کا شاعر ہے لکھتے ہیں:

> "در این فن (فرہنگ) کتابی جامع تر از برہان قاطع نیست و مستنبطش فرہنگ جہانگیری و سروری و سرمہ سلیمانی است لیکن بعد تحقیقات بہ ثبوت پیوست کہ تصحیفات و تحریفات این کتاب زیادہ بر لغات صحیحہ است" و کتابی

کہ پارۂ تحقیق جوہر لفظ فارسی در آن باشد غیر از فرہنگ رشیدی نیست و چون این عاجز ہمہ را ملاحظہ نمود، از عدم تنقیح ہر یک آگاہی یافتہ، لہذا (سراج اللغۃ) را تالیف نمود، بعد مطالعہ کیفیت تحقیق و تدقیق معلوم می شود و چراغ ہدایت گویا دفتر دوم است از سراج اللغۃ، طرفہ آنکہ صاحب بہار عجم کہ یکی از یاران فقیر است، پانزدہ شانزدہ سال پیش ازین بہار عجم تالیف نمودہ بود۔ فقیر سراج الدین علی کتاب سراج اللغۃ و چراغ ہدایت خود را باو دادم کہ ہر چہ پسند آید ازین ہر دو کتاب داخل فرہنگ خود کہ حالا مینویسد، بکند، ہیچگاہ دخل درین امر نہ نمود۔ شنیدہ ام کہ یکی از اہل کشمیر اصطلاحات قدیمہ و جدیدہ می نویسد، جمیع مرکبات سراج اللغۃ و چراغ ہدایت را داخل نمودہ بزیر دامن دیانت پنہان، تا دیگری واقف بر آن نشود، حالا بہر یکی رسم و راہ بیت جدا۔

سراج اللغۃ میں مصنف نے برہان کے تمام الفاظ کو نقل کیا ہے اور جس جگہ اس نے اپنی نظر میں غلطی سمجھی اس پر کھل کر تنقید کی ہے۔ اگرچہ سراج کا منبع برہان قاطع تھا لیکن مصنف نے برہان کی طرح شعری شواہد کا استعمال نہیں کیا۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فرہنگ سے زیادہ علم تنقید کی لغت ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحقیق کا معیار کتنا بلند تھا۔ سید محمد علی مولف فرہنگ نظام آرزو کے

---

(۱) مجمع النفائس خطی (خدا بخش لائبریری)

بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں :

"آرزو محقق بزرگ زبان و علوم فارسی است و ٹیک چند بہار کہ فرہنگ بہار عجم را نوشتہ شاگرد او بود و در آن عصر فارسی در ہند مثل عربی در عصر قجر (قاچار) ایران بوده، علمای ہند ہمہ مشغول موشگافی در فارسی بوده تالیفات مجلل از خود بیادگار گذاشتند. یک خصوصیت آن زمان این بوده و تاکنون ہست کہ شعر حال علما بوده برعکس ایران قجری کہ شعر بیچارہ از غافل علمی فرار و در بازار و دربار افتاده بود و دوم بہتر از اول نبوده چون عصر پہلوی تجدید علوم و جلال ایران است خوب است. یک خیابان جدید تہران بنام آرزو و دیگری بنام ٹیک چند نامیده شود تا دلیل بر قدردانی ایران امروز از خدمت گذاران فارسی باشد۔"

سراج اللغۃ کی تصنیف و تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اما بعد می گوید ناواقف زبان گفتگو سراج الدین علی متخلص بہ آرزو کہ چون پس از زبان مبارک عربی لسان فارسی را دید کہ افصح لغت است عمر گران مایہ را صرف تحصیل آن گردانید و کتابی در حل لغات و کشف معضلات (مشکلات) این زبان چون فرہنگ رشیدی کہ تنقیح و تدقیق شعر بسیار در آن بکار برده و برہان قاطع کہ جامع ترین کتب این فن است نیافت لیکن بعضی چیزہا کہ احتراز

ازآن در شریعت سخن فہمی واجب و در این دو کتاب
بسیار بہ نظر آمد خصوصاً در برہان قاطع کہ تصحیف
وتحریف لغات ومعانی را بیش از تنقیح دخل است
چنانکہ انشاء اللہ تعالیٰ معلوم شود لہذا بتائید الٰہی
نسخہ درین باب تالیف نمودم و شواہد واسناد معانی
را نظر برآنکہ در فرہنگ جہانگیری وسروری ورشیدی
مرقوم بود نیاوردم مگر در بعضی مواقع و در اثنای نوشتن
کتابی در این علم نیز بنظر مولف درآمدہ تالیف یکی از
فضلای شوشتر ایران موسوم بہ مجد الدین علی
المتخلص بہ قوسی بہ دستخط مصنف وآن مسودہ بود کہ از کم
مددی طالع رواج نیافتہ و اختر تداولش نتافتہ
چون اکثر سخنہای او بوی از تحقیق داشت درین نسخہ
درج نمود و بہ تحقیقات خویش افزودم وکتب این علم
کہ در تالیف وتصنیف این کتاب در نظر مولف
بود سروری وجہانگیری ورشیدی ومویدالفضلا ودلائل
وفرہنگ قوسی و برہان قاطع وفرہنگ موئسی وکشف اللغات
وبعضی از شرح گلستان و مثنوی مولوی وغیرہ بود"
خان آرزو نے سراج اللغۃ میں برہان، جہانگیری اور رشیدی کی
بہت سی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لیے یہ نا مناسب نہ ہوگا
اگر ہم یہاں کچھ الفاظ بطور نمونہ کے نقل کر دیں۔

آقال[1] : بقاف بوزن پامال در برهان افکندنی و بکار نیامدنی، و این خطا است و تصحیف است اما خطا از جهت آنکه قاف در فارسی نیامده و تصحیف بدان سبب که آخال بجای معجمه است.

آماج[2] : بمیم بوزن تاراج در برهان خاکی که به نشانهٔ تیر نصب کنند چه آماجگاه جای را گویند که نشانه در آنجا نصب کنند، مولف گوید این عبارت است مهمل و دلیل مخالف دعوی پس صحیح بمعنی نشانه است چه آماجگاه خاکی را گویند که جمع کرده نشانهٔ تیر را بر آن اگزارند

اندام[3] : بوزن بدنام بمعنی جسم و تن کذا فی البرهان و چون در هیچ فرهنگ معتبر نیست ظاهرا از لفظ اندام که بمعنی بدن آمده تصحیف کرده

آرغیده[4] : بوزن غنوده در برهان بمعنی غضبناک و خشم آلوده گفته. مولف گوید ظاهرا تصحیف است و همان صحیح ارغنده است بوزن ارزنده

باد هرات[5] : باد شمال بدان سبب که این باد هرات اکثر می وزد و شمال هرات مشهور است و قوسی گوید که هفت ماه لاینقطع شمال در هرات می سوزد و از عجب عجائب آن ست که در برهان قاطع در تفسیر این لفظ نوشته که "باد هرات باد شمال را گویند و آن از طرف مشرق بجانب مغرب است بر خلاف دبور" چراکه بدین معنی صبا است نه شمال غالباً سهو القلم است

۱- برهان قاطع ۵۲ حاشیہ میں آخال دیا ہے (لغت نامہ)
(۲) ایضاً ص ۵۹ (۳) برہان ص ۸۷، حاشیہ میں ہے کہ موید الفضلا میں بھی اسی معنوں میں آیا ہے۔ اس کے لیے کوئی مثال نہیں دی ہے ممکن ہے یہ اندام ہو (لغت نامہ)
(۴) [illegible]

باغل[1]: بوزن بابل در برهان جای گاو و گوسفند، مولف گوید این خطا است.

پرنیان[2]: بفتح اول و کسر و نون دیبا منقش در غایت لطافت و در برهان است که "پرنیان بوزن سختیان حریر و دیبای منقش در نهایت لطافت و بعضی ببای ابجد آورده اند و گفته اند که پوششی بوده که پادشاهان قدیم آنرا بغال داشتند و روزهای جشن پوشیدندی که گفتندی که جبرئیل این را از بهشت آورده و بعضی گویند جامهٔ رستم زال بوده است که از پوست پلنگ دوخته بود و شکل در آن مرقوم بود" و این از اعجب عجائب است زیراکه جامهٔ رستم ببر بیان بدو یای موحده بلکه ببای موحده است و این لفظی است مشهور خاص و عام و در این قسم الفاظ تصحیف کردن دال در دلالت بر کمال قلت تتبع یا عدم فهمی یا بی پروای تمام است.

بزله[3]: بفتح اول و لام در برهان سخنان شیرین و لطیف و این غلط است چه بدین معنی بذال معجمه است چنانکه در عامه فرهنگها است بلکه خود نیز در فصل ذال معجمه آورده و این از عجائب است.

چکاک[4]: بوزن هلاک در برهان بمعنی پیشانی که عرب ناصیه گویند و قباله نویس[6] و آن را نیز گویند که در او گوهر سوراخ کنند، مولف گوید این معلوم نیست که صاحب این کتاب را چه پیش آمده که این

---

(۱) برهان قاطع ص ۲۲۴

(۲) برهان ص ۳۰۹، حاشیه میں ہے، "پہلوی پرنیکا" تا مرادیا ۱۶۲" اس کا معرب برنکان (ابن درید) (۳) برهان ص ۲۷۴، مصحف بذله (۴) برهان ص ۶۵۰

(۵) برهان ص ۶۵۰، چکاوہ کے معنی بھی پیشانی کے آئے ہیں۔

(۶) برهان ص ۶۴۸، پر چک قباله نویس کے معنوں میں آیا ہے۔

قسم تصحیفات در الفاظ مشہور می کند. بمعنی اول چکاد بدال است
نی ثانی بصاد مہملہ مشتق از صک که معرب از چک است و آن
ئہ صفت است که در اصل حرف مستعمل شود مثل حداد و رمال و امثال
ن و بمعنی سیوم بجای حطی است و لفظ عربی الاصل۔

شت: بضم خا دوم انگشت، در برہان جای که انگور دران ریزند
ند زنند تا شیرۂ آن برآید. مولف گوید که این خطا است صحیح چرخشت
ہم فارسی است.

رگر (۲): بفتح در برہان بمعنی خرمن ماه دہاله که اغلب تصحیف خرگاه است
که تنہا بدین معنی آمده۔

ال (۳): بضم اول. در برہان بوزن و معنی زغال که انگشت نیز گویند
ین خطا و تصحیف است بدین معنی بزای معجمه است و زغال و
ل یکی است که غین بکاف فارسی بدل شده و عجب از صاحب
ن کتاب که چنین لفظ مشہور را غلط و تصحیف خوانده.

رک (۴): بوزن زیرک در برہان غلام بچۂ ترک مقبول لیکن تصحیف
ت صحیح برای مہملہ است بمعنی طفل کوچک.

سیماب (۵): معروف در برہان خیره و بی حیا نیز و ظاہرا جیوه را
معنی سیماب است به تصحیف، خیره خوانده.

برہان قاطع ص ۷۲۸، اس کے حاشیہ میں ہے کہ خرخشت مصحف چرخشت ہے
برہان ص ۷۶۳ (۳) برہان ص ۹۵۹، حاشیہ میں مصحف زگال بیان ہوا ہے
برہان ص ۱۰۵۱، حاشیہ میں مصحف زیدک آیا ہے۔
برہان ص ۱۲۰۹، حاشیہ سیم + آب اور سیم خرد میوه کے معنوں میں آیا ہے: زر
زرد دنیا پرستان را منافق میکند پشت و زرد باشد یکی آئینہ بی سیم را با تفی

شتاه[1] : بوزن زگاه در برهان شنا وری و آب ورزی و این تصحیف محض است صحیح بنون است۔

فرنه[2] :۔ بفتح اول و نون در برهان نفرین و لعنت و این تصحیف فریه است۔ به تحتانی۔

قنیزه[3] :۔ بکسر نین و های ملفوظ در برهان هر چیز زشت و پلید و این خطا است۔ صحیح با فا است و نفاف چنانکه خود نیز آورده و این از عجایب است۔

کبی[4] :۔ بوزن صبی در برهان سیاه نوشته و این دو وجه خطا است یکی آنکه بیای فارسی است به تازی و دوم آنکه قید بیجا است

کریغ[5] :۔ بضم اول و یای مجهول و غین نقطه دار در برهان بمعنی گریز ماخوذ از گریختن و بمعنی پر ریختن جانوران پرنده هم بنظر آمده، مولف گوید این خطای فاحش است چرا که بمعنی گریختن بکاف فارسی است نه تازی و این از اعجب عجایب است۔

کیبریان[6] : بیای حطی بوزن مهمان در برهان نداد قربان و این مصحف است صحیح کربان بوزن و معنی قربان۔

بقیہ حاشیہ ص ۱۱۵ طاہر وحید " فرہنگ نظام، ذرک : ینا اص ۱۳۲ ح ۴

(۱) برہان ص ۱۲۵۲، حاشیہ میں مصحف "شناه"۔ شنا = آشنا آیا ہے۔

(۲) برہان ص ۱۲۷۱، حاشیہ میں مصحف " فریہ "، سراج اللغۃ بنقل فرہنگ نظام ج ۵ ص ۱۵، رک فریہ (۳) برہان ص ۷۸۴، حاشیہ میں رودکی سمرقندی (لغت فرس ص ۲۵) کا یہ شعر شاہد کے طور پر آیا ہے :

دین فرشتہ بپرتو مرا خوار گرفت بر ہانا و از وایزد جبار مرا

(۴) برہان قاطع ص ۱۵۹۴، حاشیہ میں پارسی میانہ کپک از سانسکرت کپ۔ بقیہ صفحہ ۱۱۷

یاره[1] : بوزن چاره دست برنجن و تعاف معرب آن و بمعنی طوق گردن
چنانکه در برهان آورده هیچ نسخه بنظر نیامده

خیرو[2] : بکسر گل خطمی، فرخی گوید:

تا خوید نباشد برنگ لاله   تا خار نباشد ببوی خیرو

این است تحقیق قوی و در جهانگیری با اول مفتوح نام گلی
است سرخ و سفید رنگ و دیگر الوان نیز و این خطا است چراکه
خرو بحذف یا و کسر اول بدین معنی آمده و آن مخفف خیرو است
چنانکه سابق ذکر یافت در رشیدی گوید آن گلی است زرد خوشبو.
مولف گوید که از بیت فرخی نوشته ارباب فرهنگ بصورت پوست
که آن گل خوشبو می باشد و حال آنکه آنچه در هندستان آنرا
خیر خطمی گویند و در دواها بکار برند، سرخ بی بو می باشد و بفتح
اول شهرت دارد و چنین خیری بفتح اول گلیست دیگر سرخ رنگ
که گلشن کوچک تر از گل خیرو باشد و وجه این تفاوت هیچ معلوم نیست

بقیه صد ۱۱۶

"هلو بشمال. ص ۷۸" ورک لافر، سینو - ایرانیکا، ورک: تاوادیا ۱۶۲: ۲/
(۵) برهان ص ۱۶۳۴، حاشیہ میں گیج گریغ دیا گیا ہے۔
(۶) برهان ص ۱۷۵۴ .

---

(۱) برهان ص ۲۴۱۵

(۲) برهان ۸۰۲، جہانگیری ص ۲۲۶۸ : فرخی گوید (لغت فرس ص ۱۴۲)

واغلب که شهرت به غلط باشد ودر برهان که به رای منقوطه نیز آورده تصحیف است.

خیری(۱): بکسر اول و یای معروف در جهانگیری گلی است زرد رنگ که میان آن سیاه بود وآنرا همیشه بهار خوانند و تتاری گویند وصاحب رشیدی خیرو و خیری را یکی گفته وحق است که خیری معرب خیرو است کما فی الصراح و عجب از جهانگیری که بمعنی مطلق رنگ سرخ نیز آورده وگل مذکور را زرد گفته وآنچه در هندستان دیده شد آنست که خیری گلی است سرخ رنگ وآن را خطمی وخیاری گویند هرچند از درون آن قدری زرد هم باشد اما سرخی آن غالب است ودر برهان است که انواع آن بسیار است یکی از آن سیاه رنگ باشد وآنرا خیری خطای گویند ودیگری بنفش وآنرا خیری هروی وهفت رنگ گویند ودیگر سفید وسرخ است ونیز خیری خرامی گویند ویک نوع زرد است که آنرا خیری شیرازی خوانند وگل همیشه بهار همان است ونیز خیری رواق وایوان خانه وبدین معنی هم سری به های هوز نیز آمده واین بدل است چراکه در فارسی خا بها بدل شوند.

(۱) برهان قاطع ص ۸۰۲ وجهانگیری ص ۲۲۶۸، منوچهری گوید (دیوان ص ۱۸)

تا گل خیری بود چو روی معصفر ... تا تن سنبل بود چو زلف مجعد

سنائی گوید: در دیوان ص ۸۸۴)

باش با من تازه چون شاه پرم ... تا نگردم همچو خیری دلفگار

زرتشت بهرام پژدو گوید (اردا ویرافنامهٔ منظوم ص ۱۸)

زسرما گشته چهر شاخ خیری ... بزیر برف مانده در اسیری

« اگر عورت را به آب برگ خیری طلی کنند زن بار گیرد» فرخنامه ص ۱۴۷

دوشه[1]: بوزن خوشه در جهانگیری بمعنی ظرفی که در آن شیر دوشند رشیدی گوید آن شیر دوشه و گاه دوشه است نه تنها دوشه و این خطاء غلط است چراکه دوشه تنها بدین معنی آمده چنانچه سروری و قوسی نیز آورده اند. دوشنه با ضافت نون بدین معنی

کاسه گر[2]: بکاف فارسی معروف و نام شخصی که قول کاسه گر مخترعه اوست و اینکه در برهان نام نوای و قولی گفته محل نظر است و آنچه جهانگیری اسناد این معنی آورده دلالت بر مطلوب ندارد، و بمعنی نقارچی و نقاره نواز چنانکه در اکثر نسخ است نیز خطا است بدین معنی کاسه نواز است نه کاسه گر چنانچه جوهر لفظ دلالت دارد و در رشیدی کاسه گر نام مطربی گفته که کاسه را بچوبی خوبی نواختی و این نیز خلاف جوهر لفظ است زیراکه درین صورت نیز کاسه نواز باید نه کاسه گر پس صحیح آنست که ظاهرا شخصی کاسه گر خواهد بود که صاحب سرود آهنگ بود و کاسه نواز بمعنی آمده چنانکه صاحب برهان خود آورده و در جهانگیری نام خطی از هفت خط جام، و در برهان نام خط ششم[3] از خطوط جام گفته و ظاهرا خط کاسه گر باشد نه تنها کاسه گر۔

---

(۱) برہان ص ۸۹۸ و جہانگیری ص ۱۹۹۹ (۲) برھان ص ۱۵۶۶ و جہانگیری ص ۴۳۵ جہانگیری میں ہے، چہار معنی دارد اول معروف است، دوم نام نوای است از موسیقی. نجیب جرباذقانی۔ حالت سرو چنانست که ذوقی دارد نفس بلبل و آن دیدیه کاسه گری سیف اسفرنگی: نوبت کبریا زنی چول بنشاط سوراد۔ بهم دماز مدمه بره کاسه گرئی سیوم نام خطی است از جمله هفت خط و آنرا خط کاسه گر گویند، چہارم نقاره نواز راگویند،، ایک شعر مولوی معنوی کا ہے ع ہیچ کاسه گر کند کاسه تمام بهر عین کاسه نه بهر طعام

بقیه صفحہ ۱۲۰ پر

اس کتاب کے نسخے رامپور، انجمن آسیوی بنگال اور دیوان ہند کے کتابخانوں میں ملتے ہیں۔

چراغ ہدایت[1]:

چراغ ہدایت ایک مختصر فرہنگ ہے۔ دراصل یہ سراج اللغۃ کی جلد ہے۔ اس میں ان الفاظ کو لیا گیا ہے جو جامی کے بعد صفوی عہد کے شعراء کے یہاں مستعمل ہے۔ چراغ ہدایت کی تصنیف کا مقصد خان آرزو کے نزدیک یہ تھا کہ صفوی عہد کے شعرا کے الفاظ اور فقرات کو جمع کرے۔ کیونکہ وہ نئے الفاظ جو ایران کے شاعروں نے اپنے یہاں استعمال کیے تھے ہندوستانی شعرا کے لیے بہت ضروری تھے اور وہ فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس سروری، رشیدی اور برہان قاطع میں نہیں پائے جاتے تھے۔ چراغ ہدایت اس جملے سے شروع ہوتی ہے:۔

"اما بعد حمد واضع جمیع لغات و صلوات برا فصح و افضل موجودات۔ می گوید فقیر کثیر التقصیر سراج الدین علی آرزو تخلص الخ"

بقیہ حاشیہ :۔ خاقانی دیوان ص ۲۹ و ۱۲۷

نوای باربد و ساز بربط و مزمار — طریق کاسہ گر و راہ ارغنون وستار

کاس بخندید کز نشاط سحرگاہ — کوس بشارت نوای کاسہ گر آرد

و نیز رک : تاریخ تمدن ایران ساسانی ص ۱۴!

(۳) خط ششم جام کے لئے دیکھئے "نردینا و تاثیر آں در ادبیات پارسی ص ۲۷۵"

(۱) بلاک مین جے، اے۔ ایس۔ بی ۳۷، پی ٹی ! (۱۸۶۸) ص ۲۵۔ ۲۷

نسخ خطی: ریو ii ۵۰۱ بی، iii ۹۹۷ اے، ۱۰۷۰ بی انویٹو ۲۵ ۱۴۲۱۴ ۳، ۱۴۲۴،

انو بیو کرزن ۔ ۵۲۶، بانکی پور ۱x ۸۰۷ ۔ ۸۰۹؛ برلن وغیرہ

چراغ ہدایت میں فارسی کے کم استعمال الفاظ اور مرکبات و مصطلاحات شامل ہیں، یہ جزو جزو اول سے زیادہ مقبول ہے اس کتاب سے بھی مصنف کی طباعی کا پتا چلتا ہے اس لیے کہ مصنف کے سامنے اس طرح کی کتاب کا دوسرا نمونہ موجود نہ تھا۔ قدیم فرہنگوں جہانگیری، رشیدی، سروری، برہان قاطع وغیرہ مخصوصاً مرکبات کے لغات نہیں ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی جانکاہی اور جانفشانی دکھائی ہے اس نے تمام لغات اور اکثر متون کا بڑی دقت نظری سے مطالعہ کر کے اس کے لیے مواد حاصل کیا اور چونکہ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت بے نظیر تھی اس لیے بہت مقبول ہوئی۔ اس کے نسخے بھی عام طور پر ملتے ہیں یہ غیاث اللغات کے حاشیے پر شایع ہو گئی ہے

مصنف نے وجہ تالیف بیان کرتے وقت لکھا ہے کہ سراج اللغات کا دفتر دوم دراصل شعرائے متاخر کے مصطلحات پر مشتمل ہے اور چونکہ یہ مصطلحات فرہنگ جہانگیری، سروری، برہان قاطع وغیرہ میں نہیں ہیں اس لیے ان لغات کی مدد سے دواوین کا مطالعہ ممکن نہیں، شعری اصطلاحات اور دوسرے مرکبات جو دواوین میں قدم قدم پر ملتے ہیں وہ کسی فرہنگ میں شامل نہیں، اس ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی جس کا مقصد ان لوگوں کی ہدایت تھی جو متاخرین شعرا کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے بلاشبہ یہ نہایت سودمند لغات ہے جس سے مصنف کی دقیقہ سنجی کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے مصنف نے اپنی اکثر بعد کی کتابوں میں اس لغت سے استفادہ

کیا ہے خصوصاً مثنر میں جا بجا اس لغت کے حوالے ملتے ہیں۔

اس کتاب کے نسخے عام ملتے ہیں۔ کتابخانہ سفیعیہ، لاہور کے نسخہ پر آرزو کا اپنا ترقیمہ مورخہ ۲۷ر رجب ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کا دیا ہوا ہے۔ ترقیمہ کا عکس نوادر الالفاظ طبع انجمن ترقی اردو کراچی ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء کے صفحۂ پچاس کے بعد دیا ہے ایک اور نسخہ جو اسی کتابخانے میں موجود ہے ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۱ء میں نقل ہوا ہے۔ منقول کا مقابلہ ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۵ء میں آرزو کے سامنے ہوا اور اس پر آرزو کے دستخط تھے۔ بانکی پور میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ دانش گاہ پنجاب میں ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء اور دیوان ہند میں ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء (صرف نصف آخر) کے نسخے موجود ہیں علی گڑھ کے کتاب خانے میں بھی اسکے کئی نسخے موجود ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے

۱۔ چراغ ہدایت ۱۱۷۵ھ/ ۱۷۶۱ء (دفتر دوم از سراج اللغات کاتب شاہ بہکھاری احسن گلکشن ۸۹۱/۵۵۲۹ فارسیہ لغات

۲۔ سراج اللغات۔ دربیان لغات و اصطلاحات شعرا متاخرین چراغ ہدایت یونیورسٹی گلکشن فارسیہ لغات ۲۱۔ دفتر دوم۔

۳۔ سراج اللغات اصل دوم در اصطلاحات قدیم ۲ م ۲ ھ/ ۱۸۲۶ء ج۔ ف۔ ۶۔ ھ حصہ دوم از دفتر اول

۴۔ سراج اللغات۔ دربیان الفاظ و اصطلاحات شعرا متاخرین مسمّی بہ چراغ ہدایت نستعلیق۔ دفتر دوم سلیمان گلکشن نمبر $\frac{۵۶۷}{۱۲}$ لغات فارسی، ورق ۱۷۶۔ کاتب ثناء اللہ کتابت ۲ م ۱۲ھ/ ۱۸۲۲ء

۵۔ سراج اللغات، دربیان لغات و اصطلاحات شعراء

متاخرین مسمٰی بہ چراغ ہدایت،" دفتر دوم، ج ف ۴۴م، کتابت ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء، ورق ۱۳۲۔

نوادر الالفاظ: تصحیح غرائب اللغات[1]:

نوادر الفاظ عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغت کی تصحیح ہے جس میں اردو کے وہ الفاظ ہیں جو فنی اعتبار سے مشکل ہیں اور جن کے متبادل الفاظ فارسی، عربی اور ترکی میں پائے جاتے ہیں لیکن مشہور نہیں ہیں۔ آرزو کی تصنیفات کی فہرست صحف ابراہیم کے برلن کیٹیلاگ کے صفحہ نمبر ۶۳۷ پر درج ہے۔ اس میں ان کی اس تصنیف کا ذکر ہے:

" نوادر الالفاظ در بیان لفظ ہندیہ کہ فارسی وعربی این شہرت ندارد"

ریو کے قول کے مطابق آرزو نے ان ہندی الفاظ کو جن کے فارسی اور عربی الفاظ ہندستان میں رائج نہیں تھے اور نہ ان کو عام طور پر آسانی سے سمجھا جا سکتا تھا پر تجدید نظر کر کے غرائب اللغت کی تصحیح کی، ممکن ہے کہ نوادر الالفاظ اور غرائب اللغت کا دوبارہ طبع کیا ہوا نسخہ ایک ہی ہو یا دونوں میں بہت زیادہ مشابہت ہو۔ اردو لغت نویسی کے سلسلے میں آرزو کی تالیف نوادر الالفاظ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۱ء ہے

---

(۱) نسخہ خطی: ریو iii ۱۰۳۰ب، اے، ہانکی پور ۱۳۴۸ x، انڈیا آفس نمبر ۱ سپلیمنٹ ۹۶۹ (۷) علی گڑھ مں ۵۶ نمبر ۱۶، ۲۱۔

چنانچہ آرزو نے نوادر میں لفظ بیساکھ کے ضمن میں خود تصریح کی ہے:

"لیکن تفاوت در بیساکھ و فروردی اتفاق می افتد چنانکہ امثال کہ نوروز بست وچہارم محرم ۱۱۶۵ھ واقع شدہ و آن غرۂ فروردی است و در بیساکھ نوزدہ یا بست روز می باید"۔

نوادر کا سبب تصنیف آرزو نے دیباچے میں خود بیان کیا ہے:

"می گوید فقیر حقیر . . . آرزو کہ یکی از فضلای کامگار وعلمای نامدار ہندوستان جنت نشان کتابی در فن لغت تالیف نمودہ مسمّی بہ غرائب اللغات ولغات ہندی کہ فارسی، یا عربی یا ترکی آن مرقوم فرمودہ چون در بیان معانی الفاظ تساہل یا سقم بنظر آمد لہذا نسخہ در این باب ونیز آن چہ بہ تتبع ناقص این کمال دوست در می آید بران افزود"۔

کہنے کو تو یہ تصنیف غرائب اللغات کی تصحیح وترمیم ہے مگر ان مفید اور عالمانہ تنقیدوں اور اضافوں کو دیکھ کر جن کا ثبوت ہر ہر صفحہ پر ملتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تالیف اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور غرائب اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

آرزو نے معنوی اصلاح کے علاوہ غرائب کی ترتیب کو بھی درست کیا کیونکہ غرائب میں پہلے حرف کی رعایت تو تھی لیکن دوسرے حرف کی رعایت ملحوظ نہ تھی۔ انہوں نے نوادر میں اس سقم کو دور کرنے کی کوشش کی ہے آرزو نے غرائب کے سب الفاظ کو نوادر میں شامل کرلیا ہے۔

انہوں نے اپنی طرف سے جن الفاظ کو شامل کیا ہے وہ یا تو کنا بی ہندی (سنسکرت) سے متعلق ہیں یا پھر ترکی اور فارسی کے ایسے الفاظ ہیں جو اردو کا جزو بن گئے ہیں جن کو غرائب کے مصنف نے خالص فارسی سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح آرزو نے بھی بعض جملوں کا اضافہ کیا ہے جس کی بنا پر نوادر میں مفردات کے علاوہ چند مرکبات اور جملے بھی زیادہ شامل ہو گئے ہیں، اگرچہ ان الفاظ کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ایک خاص بات جو آرزو کو فارسی اور اردو کے لغت نگاروں پر فوقیت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ علمی وسعت کے علاوہ ان کی معلومات کا بہت سا حصہ علمی مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ وہ الفاظ کے مفہوم کے تعین کے لیے صرف عربی و فارسی کی قدیم لغات پر بھروسہ کر لینے کو کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی دی ہوئی معلومات کو ذاتی تحقیق اور چھان بین سے ٹھونک بجا کر بھی دیکھ لیتے ہیں، اس غرض کے لیے وہ لغت اور ادب کے عام ماخذ کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کی مستند کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ملکوں کے طبعی اور مجلسی حالات اور رسوم و رواج کی تحقیق کرتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے اطوار کے معاملے میں ذاتی تجربے کے ذریعہ بھی تحقیق کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان سب ماخذ سے استفادہ کرنے کے بعد لفظوں کے اصلی مفہوم متعین کرتے ہیں اور تقریباً ہم معنی الفاظ کے لطیف امتیازات کو واضح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کا تعلق اپنے ملک سے ہے ان کے سلسلے میں عملی تجربہ اور مشاہدہ و تحقیق سے کام لیتے ہیں اور جو چیزیں ایران توران سے متعلق ہیں ان کی ماہیت ہندستان میں آئے ہوئے ایرانیوں

سے دریافت کرتے ہیں۔

آرزو نے نوادر میں بھی توافق کے اصول سے بڑا کام لیا ہے اور جا بجا اس اصول کے تحت قاعدے بنائے ہیں۔ ذیل میں کچھ الفاظ بیان کیے جاتے ہیں جن میں آرزو کے نزدیک توافق پایا جاتا ہے۔

کتابی ہندی (سنسکرت)	فارسی
ابھر	ابر
اپ	اب
اڈا	اده
آرا	اره
اسو	اسپ
بٹا	بره
برچھی	برچخ
بوٹا	بوتا
پھانہ	پانہ
پٹو	پتو
پرمیو	پرمیہ
پھونک	پوک
تھل	تل
تن سکھ	تنسخ
گلا	گلو
جوا	جع

کتابی ہندی (سنسکرت)	فارسی
چھچھ	ترج
چھپاگل	چغل
چپو	چپہ
لاٹو	لاتو
چھوکرہ	چہرہ
چوچی	چچو
داک	تاک
دینوک	دیوک
رند	رندا
رواں	روم
رٹھا	ریتہ
کھیس	خیش
گھڑی	گری
کرن	قرن
کونپل	کوپل
کیس	گیس
گراں	گراس
لیل	لار
ہینگ	انگ

نوادر الالفاظ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے ۱۹۵۱ء

میں شائع کی۔ اس میں مقدمہ ص۲۲۴ پر کراچی اور لاہور کے معلوم نسخوں کی فہرست دی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے نسخے بانکی پور، رام پور اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں اور علی گڈھ میں بھی اس کے کچھ نسخے پائے جاتے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ تصحیح غرائب اللغات ۱۱۵۷ھ حبیب گنج کلکشن ۵۲/۴۲ فارسیہ لغت خط نستعلیق، ورق ۱۳۵، سطر ۱۹۔

۲۔ تصحیح غرائب اللغات ہندی۔ سبحان اللہ نمبر ۸۹۱۶۵۵۲۹/۱۲ لغات فارسی۔

۳۔ تصحیح غرائب اللغات ہندی ناقص، سبحان اللہ نمبر ۸۹۱/۵۵۲۹/۱۸ لغات فارسی۔

۴۔ نوادر الالفاظ ۱۲۵۶ھ، خط نستعلیق غنیمت، ورق ۱۸۵، سطر ۱۷ سائز ۵×۵/۸، تصحیح و تنقید بر غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی یونیورسٹی کلکشن فارسیہ (۵) لغات۔ ۲۰

۵۔ نوادر الالفاظ ۱۲۱۸ھ، یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۶ فارسی لغات، تصحیح و تنقید بر غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی۔

۶۔ نوادر الالفاظ ب ت (تصحیح و تنقید بر غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی خط نستعلیق' قطب الدین کلکشن نمبر ۱۱/۴ لغات و فرہنگ فارسی، سطر ۱۹، سائز ۵/۸، ۶ × ۸/۸، ۹، ورق ۱۲۱، بر ورق اول عبارت سید قطب الدین حسن خاں مرقومہ ۱۲۷۱ھ

۷۔ نوادر الالفاظ ۱۳۴۵ھ، خط نستعلیق تصحیح و تنقید بر غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی، ذخیرہ احسن ۸۹۱/۵۵۲۹/۱ ف لغات،

سطر ۲۱، سائز ۲ ۸ × ۴ ۱۲، ورق ۸۸، منقول از نسخہ مملوکہ صاحب عالم مارہروی، کاتب سید علی ابراہیم خلیل، کتابت ۱۲۳۵ھ مقام کتابت کانپور

زوایدالفواید:[1]

یہ فارسی افعال اور اسم معنی کی فرہنگ ہے جو کہ بہت حد تک زوایدالفوایدسے ملتی جلتی ہے۔ اس کے مصنف عبدالواسع ہانسوی ہیں۔ آرزو نے یہ کتاب ہانسوی کے ہی نمونہ پر لکھی ہے یہ کتاب قواعد زبان سے بھی متعلق ہے۔

لسانیات:

مثمر[2] خان آرزو کے لسانیاتی نظریات اور قواعد زبان کے سلسلے میں مثمر ایک گراں قدر کتاب ہے۔ آرزو کا یہ بہت بڑا رنامہ ہے کہ انہوں نے ہندستانی زبان کی لسانی تحقیق کی یاد رکھی۔ ہندستانی فیلا لوجی کے ابتدائی قواعد وضع کیے اور بانوں کی مماثلت کو دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز نلوم کیا۔ ہر چند موجودہ زمانے کی تحقیق کی وسعت کے پیش نظر رزو کے بعض خیالات جن کا مثمر میں اظہار ہوا ہے آج لائق تنا نہ سمجھے جائیں گے یا این ہمہ اس کتاب میں اردو، فارسی لسانیات بارے میں بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو آج بھی کارآمد ہیں مثمر صل قواعد فارسی سے متعلق ہے جس میں تحقیق الفاظ اور حروف تہجی

---

[1] نسخہ خطی: انڈیا آفس سپلیمنٹ ۹۶۹

[2] نسخہ خطی: لاہور، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین ۲/۱۱ (فروری ۱۹۲۲) ص ۳۲

کے مختلف استعارات سے بھی بحث کی ہے۔ خان آرزو کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جلال الدین سیوطی کی کتاب مزھر کے طرز پر لکھی گئی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ شیخ کی کتاب عربی لغت سے متعلق ہے اور یہ فارسی لغت ہے۔ لیکن اس کو بھی وہی سمجھ سکتا ہے جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں سے واقف ہو۔

"اما دریافت حقیقت این موقوف است بر جامعیت
عربی و فارسی ویک فنہ کمتر بہرہ مند از آن می شود"

آرزو کو اگر ہندستانیوں میں لغت نویسی، انتقاد سخن و قواعد فارسی کا موجد و مخترع کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان سے پہلے ان فنون میں کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ انہوں نے ان تینوں فنون کی ابتدا کی اور کمال کو پہنچا دیا۔ ملا منیر لاہوری نے اگرچہ تنقید کی داغ بیل ڈالی تھی لیکن انہوں نے محض اعتراض کرنے کے طریقہ سے آگاہ کیا تھا، صحیح تنقید کیسی ہونی چاہیئے یہ نہیں بتایا لیکن آرزو نے سراج منیر، سراج وہاج اور داد سخن لکھ کر اس کو بھی بالکل واضح کر دیا ہے کہ تحقیق میں ان کا کیا مرتبہ ہے۔ ٹیک چند بہار ان کو سراج المحققین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قواعد فارسی میں ان کی دو کتابیں عطیہ کبری و موہبت عظمیٰ موجود ہیں، ان میں بھی ان کا یہی دعوی ہے کہ یہ ہندستان میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایسی کتاب لکھی ہے مثمر میں یہی دعوی کرتے ہیں:

مصنف بتتبع می داند کہ الی الآن درین فن کتابی چنیں تالیف و تدوین نیافتہ و سائل متفرقہ کہ اوائل بعضی از فرہنگہا مرقوم ست و در رسایل برخی مسطور در جنب آن حکم عدم دارد، چوں مولف در فن لغت فارسی متعدد نوشتہ ...اصول علم مذکور زربنا لاتفلم دادہ"

مثمر میں لفظ فارسی کی تشریح کی گئی ہے اور ان آثار واحادیث سے بحث کی گئی ہے جو زبان فارسی اور فارسیوں سے متعلق ہیں یا معرفت لغت سے اس اصول سے کہ فارسی اور ہندی میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں اور ان دونوں زبانوں میں اصول وحدت موجود ہے لغت نگاری کے سلسلہ میں خان آرزو نے فارسی اور ہندی لغت اور ان کی تاریخ سے اپنی کما حقہٗ واقفیت سے بہت زیادہ فایدہ اٹھایا ہے چنانچہ مثمر میں ایک موقعہ پر لکھا ہے :

"تا الیوم ہیچکس بہ دریافت توافق زبان ہندی و فارسی با آن ہمہ کثرت اہل لغت چہ فارسی وچہ ہندی و دیگر محققان این فن متحد نشدہ اند الا فقیر آرزو کسی کہ تتبع وبیرو این عاجز باشد و این را اصل مقرر کردہ و بنائی تصحیح بعضی از الفاظ فارسیہ برین گذاشتہ چنانچہ درکتب مصنفہ خود مثل وغیرہ کہ در ہندوستان بودہ اند وہیچ لحاظ نہ کردہ اند کہ دریں دو زبان توافق است"

خان آرزو پہلے شخص ہیں جنہوں نے زبان کے مسئلے کو حل کیا اس وقت یہ بحث سامنے تھی کہ استناد واستشہاد کیونکر کرسکتے ہیں وہ کہا کرتے تھے کہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے ایران کے مختلف خطے کے لوگ مختلف طرح سے تلفظ کرتے ہیں۔ اگرچہ تمام ایرانی فارسی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں، لیکن ہر خطہ کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے شیراز کی اور ہے "قزوین وگیلان وخراسان کی اور کاشان کی اور۔

اساتذہ کے یہاں صرفی ونحوی غلطیاں موجود ہیں سعدی کے اکثر اشعار تنقید

معنوی پائی جاتی ہے۔ خاقانی کے الفاظ وحشی اور غریب ہیں حزیں کے یہاں افعال غلط پائے جاتے ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو جس میں ایسے الفاظ جمع ہیں جس سے تعقید معنوی پیدا ہو جاتی ہے:-

غمگین نمی رود کسی از خاک میکدہ تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی کنند

آرزو کی رائے میں لفظ غمگین کی وجہ سے شعر کا مطلب خبط ہو گیا اس کے بجائے اگر ہرگز کر دیا جائے تو معنی صحیح ہو جائیں یعنی،

ہرگز نمی رود کسی از خاک میکدہ تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی کنند

ایرانی مختلف مقامات پر رہنے کی وجہ سے فارسی الفاظ کو مختلف طریقے سے لکھتے بولتے تھے مثلاً "چراکہ" بفتح و کسر دونوں صورتوں سے مستعمل ہے سخن بضم خا و فتح دونوں طرح جایز ہے۔ خان آرزو کا فیصلہ ہے کہ چراکہ بکسر افصح ہے اس لیے کہ یہ مرکب ہے چہ استفہامیہ اور را بمعنی برائے۔

فارسی الفاظ کے علاوہ ایرانی کبھی عربی الفاظ میں بھی حرکت کا اختلاف جائز رکھتے ہیں مثلاً سجدہ ضم کے ساتھ خراسان میں جائز نہیں ہے لیکن دوسری جگہ بولتے ہیں جیسے لفظ کافر جسے ایرانی بفتح استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض ساکن الفاظ کو متحرک استعمال کیا ہے، ناصر خسرو نے روشنائی نامہ کے خاتمہ پر عفو کو بحرکت لکھا ہے:

اگر سہوی بود دروی عفو کن دریدہ بردہ کارم را رفو کن

دوسرا اختلاف جو ایرانی جائز رکھتے ہیں وہ تلفظ میں ہے یعنی بہت سے الفاظ جو مشدد ہیں، ان کو مخفف اور جو مخفف ہیں ان کو مشدد کر دیا ہے جیسے خوش کورودکی نے مشدد نظم کیا ہے:

بیا کی گوئی اندر جام مانند گلاب استی - تجوشی گوئی اندر دیدۂ بی خواب استی

ایرانیوں میں اختلاف کی ایک تیسری صورت حذف کی وجہ سے بھی رونما ہوتی ہے مثلاً سام نریمان کے بجائے سام نر استعمال کیا ہے ؎

تو آن بادشاہی کہ گر زندہ بودی زمین بوس دادی ترا سام بن نر

خان آرزو کے خیال میں نر نریمان کا لقب معلوم ہوتا ہے ورنہ اتنے حروف کا حذف کہیں اور نظر نہیں آیا۔ ان سب صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آرزو اس بات کو مانتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ بہت دشوار ہے اس لیے کہ صاحبان زبان بھی مختلف ہیں اور وہ ایک دوسری جگہ کے لوگوں کو نہیں مانتے ہیں اسی وجہ سے وہ اس بات کے قایل ہیں کہ صاحبان زبان کو خواہ وہ ایرانی ہوں یا غیر ایرانی مستند ماننا چاہیے اور اس لیے جمال انجو شیرازی اور سروری کاشی وغیرہ نے امیر خسرو کو مستند مانا ہے

عرب سوائے کلام عرب کے اور کسی کی سند نہیں مانتے لیکن زمخشری اور صاحب تلخیص المفتاح نے ابو ہمام وغیرہ کے اقوال سند میں پیش کیے ہیں۔ ہندستانیوں کے کلام کا مستند ہونا تو ایک طرف وہ اس بات کے قایل ہیں کہ ہندستانی صاحبانِ قدرت کو فارسی زبان میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ ایرانیوں نے عربی، یونانی اور ہندی میں تصرفات جائز رکھا ہے۔ اس لیے ہندستانیوں کا تصرف بھی زبان میں درست ہونا چاہیے، وہ بیدل اور امیر خسرو کے تصرفات صحیح مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایرانیوں کو ہندستانیوں پر جو فضیلت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا علم سماعی زیادہ وسیع ہے ورنہ علم قیاسی اور کتابی میں ایرانی

۔غیر ایرانی دونوں برابر ہیں۔ ایرانی اساتذہ تو باوجود غلطیوں کے قابل استناد ہوں اور ہندستانی جو کثرت ورزش و خدمت زبان فارسی کر کے ان کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں کیونکر مستند نہ ہوں اور کیوں تصرفات نہ کریں۔ ہندی الفاظ کے فارسی میں استعمال کے متعلق آرزو کہتے ہیں کہ جب فارسی میں ترکی، عربی، یونانی، ارمنی زبان کے استعمال سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تو کیا وجہ ہے کہ محض ہندی زبان پر قید لگائی جائے اور وہ استعمال نہ ہوں۔ ہندی الفاظ فارسی میں بے تکلف استعمال ہو سکتے ہیں، اساتذہ کے یہاں اس کا استعمال جائز رہا ہے۔

آرزو نے اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اور جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ انہوں نے ایرانیوں اور عربوں کے تصرفات دکھائے ہیں مثلاً ارسطاطالیس کو جو یونانی زبان کا لفظ ہے حکیم سنائی نے سطاطالیس کر دیا، اصطرلاب کے بجائے فردوسی نے صلاّب استعمال کیا ہے۔ خاقانی نے علی الرؤوس کو علی الرُوس ہمزہ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یہاں بجائے ہمزہ کے واؤ ہونا چاہیے۔

کہیں ایرانیوں نے عربی الفاظ سے مصادر اور افعال بنائے ہیں مثلاً بتمیز دسالک یزدی کے یہاں موجود ہے طلوعیدن میر یحییٰ کاشی کے یہاں آیا ہے بسیر بصیغہ امر و حال آیا ہے۔ اسی طرح غارتیدن نظامی کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ یوں ہی فہمیدن، طلبیدن، اور رقصیدن ایرانیوں نے استعمال کیا ہے جو عربی الفاظ تمیز، طلوع، طلب، فہم، رقص غارت سے لیے گئے ہیں۔ آرزو نے اسی خیال کی ترجمانی اپنی کتاب خیابان

میں بھی کی ہے :

"طلبید ماخوذ از طلبیدن است و آن از طلب کہ لفظ عربی ست از تصرفات فارسیان است و این قسم تصرف زیادہ از پنج و شش کلمہ نیست چنانچہ طلبیدن و فہمیدن و رقصیدن و غارتیدن ..... بعضی شعرا طلوعیدن نیز بستہ اند و اہل توران نوحیدن نیز گو شد"

بعض ایرانی شعرا نے اپنے کلام کی بنیاد مضحکہ اور ہزل پر رکھی ہے اور ناموں سے مصدر بنائے ہیں مفردات کے علاوہ ایرانیوں نے اکثر عربی مرکبات میں بھی تصرف جائز رکھا ہے جو فاش غلطی ہے مثلاً نظامی نے الحی سے الف و لام گرا دیا ہے. مولانا جامی نے لہم بجائے الذین کفروا استعمال کیا ہے. کبھی یوں بھی تصرف ہوا ہے کہ عربی کی عبارت میں کچھ زیادتی کر دی ہو' جامی :

زد شیخ شہر طعنہ بر احوال حال دل   والمرء لا یزال عدو لما جہل

اصل عبارت قول جناب امیر المومنین علیہ السلام یہ ہے :

"المرء عدو لما جہلہ"

ایسی صورت میں حذف اور زیادتی دونوں ظاہر ہے بعض اوقات تصرف یوں بھی ہوا ہے کہ فارسی کلمات کو عربی کا لباس پہنا دیتے ہیں اور عربی الفاظ کے احکام ان پر جاری کر دیتے ہیں :

تا مہر نو گشت نور افشاں   ذو الخورشیدین شد خراسان

کبھی ایرانیوں نے مصدر سے عربی صیغے بنالیے ہیں جیسے تراشیدن سے متروش، کشمیر سے تکشمر. کبھی ایرانی عربی الفاظ

سے اشتقاق کرتے ہیں مثلاً فلاکت بمعنی فلک اسی طرح ایرانیوں نے
ناموں میں تصرف کیا ہے مثلاً ابراہیم بن ادھم کے بجائے وہ محض
ادہم کہتے ہیں اور حسین بن منصور کو صرف منصور۔

ایرانیوں کا ہندی الفاظ میں تصرف ملاحظہ ہو شہر متھرا
کو متورا کر دیا۔ کبھی ہندی لفظ میں سے کوئی حرف حذف کر دیا
مثلاً جھکڑ کو عرفی جکر لکھتا ہے؛

آن باد کہ در ہند گر آید جکر آید

اسی طرح ایرانیوں نے گڑ کو گور کر دیا اور راجہ بھوج کو بہو
کر دیا۔ یوں ہی کھیم کو بیم کر دیا۔ میر یحییٰ کاشی نے بھی یہی غلطی کی ہے
سنگھ کو جس کے معنی شیر کے ہیں سنگ کا ہم قافیہ کر دیا۔ بعض الفاظ
ایسے ہیں کہ فی الاصل ہندی ہیں لیکن ان سے اور فارسی الفاظ
بنا لیے گئے مثلاً ماری مار سے ماخوذ ہے جو ہندی میں زدن کے
معنوں میں آتا ہے۔ صاحب جہانگیری نے اس لفظ کے استعمال
سے ناواقفیت ظاہر کی ہے حالانکہ وہ ہندستان میں رہ چکا تھا۔
اور ہندی اور فارسی میں کس قدر توافق ہے اس سے واقف
تھا۔ اس تحقیق کا فخر خان آرزو کو ہی حاصل ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"و حق آنست کہ تا الیوم ہیچکس را توافق زبان ہندی و فارسی
با این ہمہ کثرت اہل لغت چہ فارسی و چہ ہندی کسی را نشدہ

الّا فقیر آرزو ..... عجب از رشیدی وغیرہ کہ در ہندوستان بودہ اند وہیچ لحاظ نہ کردہ کہ درین در زبان چہ قدر توافق باشد" (۱)

ان تمام باتوں سے واضح ہو گیا کہ ایرانیوں کے یہاں غلطیاں ہیں۔ انہوں نے غیر زبان کے الفاظ بھی اپنے یہاں استعمال کئے ہیں ان میں تصرفات کو بھی جائز سمجھا ہے۔ ہندوستانیوں کے اشعار کو ایرانیوں نے سند میں بھی پیش کیا ہے، لہذا آرزو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستانی بھی فارسی زبان میں ہندی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں اور ایرانیوں کے علاوہ غیر ایرانیوں کو بھی مستند مان سکتے ہیں اور فارسی زبان میں تصرفات کر سکتے ہیں جیسے کہ خسرو اور بیدل نے کیئے ہیں مثلاً خسرو:

ادمیرود بناز وگرہ می زند بزلف   مردن مراست ازگرہ او چہ می رود

فارسی میں "از کیسہ او چہ می رود" بولتے ہیں لیکن امیر خسرو کے صاحب قدرت ہونے میں کیا شک ہے۔ اور اسی لیے ان کا یہ تصرف بھی صحیح ہے کہ وہ از کیسۂ او چہ می رود کے بجائے ازگرہ او چہ می رود، استعمال کریں:

بیدل: النوید آفتاب عالمتاب

فارسی الفاظ پر عربی الف ولام کا اضافہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن آرزو صحیح مانتے ہیں ملاحظہ ہو

"چون ازراہ قدرت تصرفان نمایاں در فارسی بودہ مردم ولایت و کاسہ لیسان این ہا کہ از اہل ہند اند در کلام این بزرگوار سخن ہا دارند

---

(۱) مثمر

وفقیر در صحت و تصرفات صاحب قدرتان ہند ہیچ سخن نہ دارد بلکہ قائل است۔"(۱)

مثمر اگرچہ نہایت خشک اور مشکل موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن آرزو کی عربی میں قابلیت اور اس زبان میں ان کی تحقیق کی آئینہ دار ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ کے توافق پر جو عالمانہ بحث کی گئی ہے وہ دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اس میں قرآنی آیتوں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ جناب پیغمبر صلعم مبعوث تھے جمیع امم پر لہذا وہ تمام زبانوں کے جاننے والے تھے اس وجہ سے وہ فارسی بھی بخوبی جانتے رہے ہوں گے۔ اس ذیل میں انہوں نے رسول کے اقوال بھی پیش کیے ہیں جن میں فارسی الفاظ موجود ہیں اس کتاب میں علاوہ فارسی لغتوں کے عربی میں امام فخر رازی، قاموس، امام ثعالبی، جلال الدین سیوطی کی عربی عبارتیں نقل کرتے ہیں اور جواب بھی ایک حد تک عربی میں لکھتے ہیں، ان پر بحث کرتے ہیں اور جو بات غلط ہوتی ہے اسے واضح کرتے ہیں۔ مثمر پہلی کتاب ہے جس میں آرزو نے ایرانیوں کے نخوت و غرور کو دھکہ لگایا اور ہندوستانیوں کو ان کے فضل و کمال کی بنا پر ایرانیوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنؤ میں مکمل کی گئی جیسا کہ اس کتاب کے آخر میں درج ہے۔

دائرۃ المعارف کے مطابق مثمر کے نسخے کم ملتے ہیں۔ اس کی رو سے صرف چند جگہ اس کتاب کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ ان میں دانش گاہ پنجاب کا نسخہ ناتمام ہے۔ اور مجموعۂ کرزن (انجمن آسیائی بنگال) کے نسخے کی حالت اچھی نہیں ہے۔ لیکن دائرۃ المعارف کے مولف کو اس بات سے

---

(۱) مثمر

آگاہی نہیں ہے کہ مثمر کے دو نسخے علی گڑھ میں ہیں جس میں ایک نسخے کی حالت بہت اچھی ہے لکھائی صاف ہے اور دوسرا بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس کے علاوہ ایک نسخہ رامپور میں ہے۔ اس کا خط بھی شکستہ ہے لیکن اس نسخے کی حالت کافی خراب ہے۔ اور پڑھنے میں بہت کم آپاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں موجود ہے اور ایک اور نسخہ "خانۂ فرہنگ ایران میں مرکزِ تحقیقات" میں موجود ہے۔ علی گڑھ میں جو دو نسخے پائے جاتے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ مثمر در علم اصول لغت (عہد شجاع الدولہ) یونیورسٹی کلکشن ف (۵) لغات ۲۲، خط نستعلیق، ورق ۱۲۵، سطر مختلف

۲۔ مثمر۔ در علم اصول لغت ۱۲۲۷ھ، خط نستعلیق، ورق ۲۳۶، سطر ۱۵ سائز ۷"، ۵×۹۔

شرح :

بحیثیت نقاد خان آرزو کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی فارسی متن پر تنقیدیں بالکل نئی ہیں اسی لیے نہایت اہم ہیں۔ بلاک مین کے قول کے مطابق آرزو بہترین نقاد تھے جو ہندستان میں پیدا ہوئے اب ہم آرزو کی تنقیدوں کا مختصراً ذکر کریں گے۔

خیابان[1]

یہ سعدی کی گلستاں کی شرح ہے۔ اس کے متن میں جو الفاظ اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں اس میں ان کے صحیح معنی کا تعین کیا ہے اور ساتھ ہی قدما مثلاً میر نوراللہ احراری (م: ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) ملا سعد تتوی وغیرہ کی شرحوں میں جو تسامح اور تساہل نظر آیا اس کی

(۱) نسخہ خطی، آپ نے تحریر ص ۸۱ میں ذکر کیا گیا ہے۔

تحقیق کی پھر اس پر شرح لکھی۔ آرزو نے تیس (۳۰) سال بعد اس کتاب پر نظر ثانی کی اس میں تقریباً تین ہزار (۳۰۰۰) ابیات ہیں۔
اس کتاب کا ایک نسخہ محمد شفیع لاہوری کے کتاب خانے میں ہے
غیاث الدین رامپوری نے اپنی شرح میں اس سے استفادہ کیا اس کے علاوہ اس کے نسخے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری میں اور علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کے نسخہ کی تفصیل یہ ہے:
خیابان شرح گلستان سعدی ناقص، نستعلیق، شرح فارسی ضمیمہ نمبر سبحان اللہ ۸۹۱/۵۵ ۲۵/۲۷، ورق ۱۵

شگوفہ زار[1]:

یہ نظامی کے سکندر نامہ کے پہلے حصہ کی شرح ہے اور ساتھ ہی اس پر مفصل تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس میں چھ ہزار (۶۰۰۰) ابیات ہیں۔
اس کے دو نسخے رامپور میں ہیں۔ فہرست قلمی شمارہ ۳۹۸۵، ۳۹۸۶۔
ملا غیاث الدین نے اپنی شرح سکندر نامہ میں شگوفہ زار کو شامل کر لیا
یہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کا ایک اور نسخہ علی گڑھ کے کتاب خانے میں موجود ہے۔
شرح سکندر نامہ گنجوی سبحان اللہ نمبر ۸۹۱/۵۵ ۲۵
شرح فارسی

شرح قصائد عرفی[2]: اس میں ملا منیر اور دوسرے لوگوں کے

---

(۱) نسخہ خطی اسپرنگر ص ۲۲۶، ریو سپلیمنٹ، علی گڑھ، ص ۲۹ ۲، آ صفیہ ۲۸۲/۱ پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۲) نسخہ خطی: آئی او۔ ڈی۔ پی ۱۲۸۶، اے، ۱۲۸۶، جی سی، ۱۲۸۶ ڈی

اعتراضات کو غلط بتایا ہے اور قصائد عرفی میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ
نامانوس عبارتوں کو تازہ عبارتوں میں تبدیل کر کے صحیح معنوں میں
اس کی مقبولیت کا تعین کر دیا ہے اور مشکل اشعار کو حل کیا ہے۔

اس میں (۳۰۰۰) تین ہزار ابیات ہیں۔ دائرۃ المعارف میں
"چہار ہزار بیت" درج ہے۔ اس کا ایک نسخہ جسے اشرف بیگ خان
دہلوی نے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں کتابت کیا، محمد شفیع لاہوری کے کتاب
خانے میں موجود ہے۔ منقول میں کتابت کی غلطیاں تھیں۔ رامپور میں بھی
ایک نسخہ موجود ہے۔ فہرست قلمی شمارہ ۳۴۱۴۔ آرزو نے مجمع النفائس
میں لکھا ہے کہ اس نے شرح میں غث و ثمین کو جدا اور ابوالبرکات منیر
اور دیگر شارحین کے اعتراضات کو رد کیا ہے۔ علی گڑھ میں جو نسخہ موجود
ہے اس کا نمبر یہ ہے۔

مجمع الشعرا موسومہ سراج منیر بہ ثبت ذخیرہ شاہ منیر عالم
بکس ۲ نمبر ف۔ ورق ۲۲، سطر ۱۵۔

شرح گل کشتی :

یہ میر نجات کی مشہور لیکن مشکل مثنوی کی شرح ہے جس میں کشتی
کے فن پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ مثنوی آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس
کی تکمیل (۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء) کے بعد مکمل ہوئی۔ دائرۃ المعارف ص ۶۴
پر ہے کہ اس کے کسی نسخے کے وجود کا علم نہیں ہوا۔

سراج وہاج

یہ حافظ کے اشعار کی ایک بے ترتیب شرح ہے "یہ کشتی شکستگانیم
ای باد شرط برخیز" الخ کے معانی کے بیان میں ایک مختصر سا رسالہ ہے

اس کے نسخے بانکی پور (مخلوطہ) اور پوھار میں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نسخہ علی گڑھ کے کتاب خانے میں ہے اس کا نمبر اس طرح ہے۔
سراج وہاج درحل بیت حافظ، یونیورسٹی نمبر ۱۱۹ فارسیہ ۳، نثر۔

تنقید:

تنقید میں آرزو کی برتری مسلم ہے۔ ان کی غیر معمولی حس اور ذوق زیبا ان کے منطقی دلائل کے شانہ بشانہ ہیں اور صحیح معنوں میں ان کو نقاد بنانے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ بلا مبالغہ وہ کبھی کبھی تنقید کی سطح سے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ انہوں نے ادبی تنقید کا معیار بہت بلند کر دیا۔

تنبیہ الغافلین:(1)

شیخ علی حزین ان ایرانی علما میں سے ہیں جن کی ہندستانی فارسی شاعروں کے متعلق رائے نہایت تنقیدی اور ہتک آمیز ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں ہندستانی عالموں پر زیادہ ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ حزین کے ان ناقدانہ تبصروں نے ہندستانی عالموں کو اپنے علم کی نصاحت کو ثابت کرنے پر مجبور کر دیا۔ آرزو ان عالموں میں صف اول پر آتے ہیں جو نہ صرف ہندستانی علمیت کو منوانے کے لیے کھڑے ہوئے بلکہ انہوں نے ایرانی شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں پر تبصرے بھی کیے اور اسی سلسلے میں انہوں نے ایک کتاب تنبیہ الغافلین کے نام سے لکھی ہے جس میں علی حزین کی فارسی زبان سے متعلق غلطیوں کو اجاگر کیا ہے۔

---

(1) نسخہ خطی:۔ لکھنو یونیورسٹی لائبریری

اور ان پر کھل کر تنقید کی ہے۔ انہوں نے حزیں کے دیوان کا تفصیلی مطالعہ
کیا اور ان کے بہت سے اشعار کو لے کر ان کی غلطیوں پر بحث کی ہے۔
انہوں نے ان نکات کو تنبیہ الغافلین میں مفصل طور پر بیان کیا ہے۔
اس کتاب نے بدنوں حزیں[1] کی شہرت، کو دھکا پہنچایا۔ آرزو کی یہ
تنقید اپنے ہی دشمنوں کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی
لیکن آرزو کے کئی احباب نے ان کے بچاؤ میں مضامین لکھے۔
علی قلی والہ داغستانی نے ریاض الشعراء میں ان کی کتاب کے کچھ
اقتباسات نقل کیے ہیں جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں:

ہر چہ خواہی بکن از دوری دیدار مگو — وحشت آباد مکن خاطر ویرانی را

تہی از وحشت آباد کردن خاطر ویرانی چہ لطف دارد
اگر خاطر جمع یا خاطر آبادی بود گنجایش داشت و اگر گویند
کہ عاشق را با جمعیت خاطر چہ کار گوئیم در این جا معشوق
مخاطب است و خطاب جز در حالت وصل صورت نمی بندد
و جمعیت خاطر در وصل متصور است۔

گرانجان تر از شبنم نیست جسم ناتوان من — اگر می بود با من روی گرمی آفتابش را

در ربط این جز او شرطہ حیرانم آنکہ لطف شعر مبتذل است؛ مرزا
صایب گوید:

از ہمت سرستان بردار حزین خضری — تنہا نتوان رفتن صحرای محبت را

خضر برداشتن عبارت تازہ است خضر از عالم زاد نیست
کہ بردارند و اگر گویند رفیق برداشتن در محاورہ آمدہ گوئیم
ہمراہ برداشتن است نہ تنہا برداشتن و بر تقدیر تسلیم خضر در

---

(۱) نسخہ خطی: آئی۔ او۔ ڈی۔ پی ۲۳۴ (۲) سفینۂ حزیں ص ۳۹۔

حکم رفیق نیست یعنی استعمال این لفظ در حق متبوع
جائز نیست

صف مژگانِ تو گر سایہ بدریا فکند — خار قلاب شود در بدنِ ماہی ما

اگرچہ لطف صف در مصرع اول ہم زاید است اما در
مصرع ثانی لفظ ما ہیچ دخلی در معنی ندارد بلکہ مخل اصل
مطلب است چہ مطلب آنست کہ مژگان تو گر سایہ
بدریا افکند خار در بدنِ ماہی بسبب خار خار در جذبہ عشق
حکم قلاب بہم رساند درین صورت لفظ ما از طلب آں روی آب افتادہ

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ حزین نے تنبیہ الغافلین کی تردید
میں ایک رسالہ رجم الشیاطین تحریر کیا جس میں آرزو کے لیے یہ الفاظ
یکی از جرگۂ حرام زادگانِ اکبر آباد[1]
استعمال کیے ہیں یہ رسالہ دنیا کے کسی کتاب خانے کی فہرست مخطوطات
میں مندرج نہیں۔ گمان ہے کہ رجم الشیاطین لکھا ہی نہیں گیا۔ آرزو
تنبیہ الغافلین کی اشاعت کے سالوں بعد تک حزین کی تمام شاعری
اور شخصیت پر عمومی حملے کرتے رہے لیکن تہذیب اور متانت
کے لحاظ سے ان کی روش میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، وہ ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء
کے قریب لکھتے ہیں۔

"بقول شیخ ان کا موجودہ دیوان چوتھا دیوان ہے۔ اس
سے پہلے کے تین دیوان تلف ہو گئے۔ بہرحال یہ دیوان
جو کئی بار میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس رتبہ کا نہیں ہے

---

(۱) نگار ص ۲۱۳۔

جو شیخ اور ان کے حامیوں کا مظنون اور متیقن ہے۔ اگر یہ بھی ان تین دیوانوں کے ساتھ ملحق ہو جاتا تو وہ تمام اعتراضات جو اس پر پہنچے ہیں نہ ہوتے خدا کا شکر ہے کہ ہندستان کے تمام قبائح حسنات سے بدل گئے ان دنوں شیخ حج اور زیارت عتبات کی غرض سے بنگالے کی طرف سے روانہ ہوئے تھے لیکن عظیم آباد سے واپس آ کر بنارس میں جو ہندوؤں کا معبد عظیم ہے خلوت کش ہو گئے۔

"ترسم کہ نرسی بہ کعبہ ای اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است"

تنبیہ الغافلین کا ایک مخطوطہ دانش گاہِ پنجاب میں موجود ہے مگر یہ رسالہ صہبائی؛ قول فیصل میں چھپا بھی تھا۔

احقاق الحق:

یہ حزیں کی فارسی شاعری پر آرزو کی دوسری تنقید تھی جو کہ کلیات صہبائی میں مطبوعہ موجود ہے۔

سراج منیر:

اس میں ملا منیر لاہوری کے تنقیدی کارنامے کو جس میں ملا نے عرفی، طالب، زلالی اور ظہوری کے بہت سے اشعار پر اعتراضات کیے ہیں آرزو نے ان کو رد کیا ہے۔ اس میں تقریباً دو ہزار بیت ہیں اس کے نسخے دانش گاہ پنجاب اور پالکی پور میں موجود ہیں۔

داد سخن: آرزو نے منظومہ سازی اور سبک وغیرہ پر ایک مختصر سا رسالہ مرتب کیا ہے اس میں ملا شیدا نے ابو البرکات منیر (م: ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء) کے ایک قصیدے کا تجزیہ کیا ہے اور جتنا ممکن ہو سکتا ہے عنادلانہ

۱۔ تذکرۂ [illegible] عوام ص ۴۳، ۱۷۱ ۔ رواد غلطی است [illegible] سرانجام [illegible] دربرجواہر داشت [illegible]

۲۔ بابت: "ایں رہ کہ تو می روی بترکستان است" [illegible] مقصد ایں است کہ [illegible] مقصود [illegible]

رویہ اختیار کیا ہے قدسی (م: ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) کے قصیدے کے ہر شعر پر شیدا نے جو اعتراضات کیے ہیں اور ان کی خامیوں کا تعین کیا ہے آرزو نے اس پر بھی شرح لکھی ہے۔ شیدا قدسی کا ہمعصر بھی ہے۔ اس کتاب میں تین ہزار (۳۰۰۰) ابیات ہیں اس کا ایک نسخہ دانش گاہ پنجاب میں موجود ہے۔

قواعد:

فن شاعری میں استاد اور ماہر ہونے کی وجہ سے آرزو دوسرے قواعد نویسوں کے مقابلے میں اس صنف کے بہتر استاد تھے۔

عطیۂ کبریٰ[1]:

یہ فن "بیان معنی" پر ایک مختصر رسالہ ہے اور ادبی موضوع پر ہے۔ اس نوعیت کا یہ پہلا رسالہ ہے۔ اس میں تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) ابیات ہیں۔ یہ کتاب ایک دو بار زیور طبع سے بھی آراستہ ہو چکی ہے۔ اس کے دو نسخے دانش گاہ پنجاب میں ہیں اور چار نسخے علی گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ عطیۂ کبریٰ سبحان اللہ نمبر ۸۹۱/۵۲۲ عروض فارسی۔

۲۔ عطیۂ کبریٰ سلیمان کلکشن نمبر ۱۴/۱۲ قواعد فارسی، شامل نمبر ۳۸۶ انشاء فارسی، ورق ۱۰، کتابت ۱۲۵۸ھ۔

۳۔ عطیۂ کبریٰ ج ف بیان ۵۱۹۔

۴۔ عطیۂ کبریٰ ج ف بیان ۶۸۹۔

---

(۱) نسخۂ خطی۔ انوسیو کرزن ۱۱۰، بانکی پور ix، ۸۵۴۔

موہبت عظمیٰ:

فارسی زبان میں فن معانی میں مختصر رسالہ ہے۔ یہ مفتاح و تلخیص کے طریق پر آٹھ باب پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء کا لیتھو پر چھپا ہوا دانشگاہ پنجاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ چار نسخے دانشگاہ علی گڑھ میں بھی ہیں علی گڑھ کے نسخوں کی تفصیل حسب ذیل ہے

۱۔ موہبت عظمیٰ سبحان اللہ نمبر $\frac{۸۹۱/۵۵۲۳}{۱}$ معانی در بیان فارسی

۲۔ موہبت عظمیٰ ج ف ۱۴۹

۳۔ موہبت عظمیٰ ج ف معانی ۱۴۴

۴۔ موہبت عظمیٰ حبیب گنج فارسی $\frac{۵۰}{۱۴۶}$

معیار افکار:

یہ قواعد پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ اس میں علم ہجا و نحو فارسی کے بارے میں کافی اہم معلومات درج ہیں۔ اس کا ذکر عطیۂ کبریٰ کے شروع میں ملتا ہے۔ لیکن اس کتاب کا کوئی نسخہ ہماری نظر سے نہیں گذرا اور نہ ہی کسی دوسرے ذریعہ سے یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا کوئی نسخہ موجود ہے۔

مفتاح و تلخیص:

اس میں تقریباً دو ہزار ابیات ہیں۔

تذکرے

مجمع النفائس: اس کتاب کی تکمیل میں آرزو نے انسائیکلوپیڈیا نویس کا حق ادا کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس میدان میں دوسرے

سوانح نگاروں کے مقابلے میں ان کو سبقت حاصل تھی۔ اس میں انہوں نے تقریباً ایک ہزار سات سو پینتیس (۱۷۳۵) شعرا اور ان کی شاعری[1] کا ذکر کیا ہے، ان پر نقادانہ اشارے کیے ہیں۔ اختلافی نکات پر مفصل بحث کی ہے اور فارسی زبان و ادب سے متعلق اپنی ناقدانہ رائے بھی دی ہے، دلچسپ حکایات و وقایع بھی بیان کیے ہیں، تاریخی لطائف بھی لکھے ہیں۔ یہ دوسرے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ ضخیم بھی ہے۔ اس کا آغاز غالباً ۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ہوا۔ اور یہ ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۱ء میں مکمل ہوئی لیکن اس میں ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۳ ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء تک کے اضافے پائے جاتے ہیں[2]۔ اس کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہوئی ہے۔

مجمع النفائس کی تالیف کی تقریب کے سلسلے میں اس کے دیباچے میں آرزو اس طرح رقم طراز ہیں:

"می گوید فقیر ۔۔۔ کہ از تباشیر صبح طفلی تا الآن کہ آفتاب زرد پیری است شوق تمام و محبت مالا کلام بہ خواندن اشعار فارسیہ دارد ۔۔۔ سابق مدتی برین دواوین و تذکرہ ہا و سفاین وغیرہ کتب بزرگان نمود ۔۔۔ روزی در پیش آشنای قدح این حال بزرگان گذشت کہ خواندہ و نخواندہ از نیسان ما برابر گشت۔ اتفاقاً آن عزیز بعد دو سہ روز سفینۂ ضخیمی ۔۔۔ ۔۔۔

---

(۱) نسخہ خطی بانکی پور، ix، ۸۵۴؛ انڈیا آفس سپلیمنٹ ۹۶۹۔

(۲) دیباچہ دستور الفصاحت ص ۴۳ بعد

پیش فقیر آوردہ تکلیف کرد کہ حالا ہرچہ از اشعار اساتذہ انتخاب شود برین ثبت باید فرمود ..... شروع در انتخاب نمودم تا آنکہ یک صد دیوان متوسطین و متاخرین بانتخاب رسید و در سفینۂ مذکور اجزاء دیگر قلمی گردید. و درین بین بخاطر رسید کہ پارۂ از حالات این عزیزان ہم اگر مرقوم شود دور نباشد، لہذا بعضی از تذکرہ ہا مثل تذکرۂ تقی اوحدی و تذکرۂ نصرآبادی و کلمات الشعراء و تحفۂ سامی وغیرہ نیز دیدہ ہرچہ از آنہا خوش آمد بنوشتن آن پرداختم و بہ مجمع النفایس موسوم ساختم. و چون غرض اصلی نوشتن اشعار دلپسند خود است و نوشتن حالات ضمنی، لہذا در تحقیق آن چندان نکوشیدہ و در تلاش آن چندان نہ دویدہ . . . . بیدار تخلص از تلامذۂ فقیر تاریخ اختتام این تذکرہ چنین گفت :

این تذکرۂ سخنوران گیہان   بی مثل چو بنوشت سراج الدین خان
بیدار بآرزو چنین کرد رقم   گلزار خیال اہلِ معانی جہان

آرزو کا کہنا ہے کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ان کو فارسی اشعار پڑھنے کا بے پناہ شوق تھا۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ دواوین، تذکروں، سفینوں اور بزرگانِ دین کی کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا، ایک روز ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ کے اس طرح کے مطالعے سے کوئی فایدہ نہیں ہے، وہ عزیز چند روز بعد ہی ایک ضخیم سفینہ لے کر آرزو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایش کی

کہ جو کچھ اساتذہ کے اشعار میں سے منتخب ہو اس پر لکھ دیجیے۔ آرزو نے تقریباً ایک سو متاخرین اور متوسطین شعرا کے کلام میں سے اشعار منتخب کیے اور سفینہ مرتب کیا۔ پھر ان کے دل میں یہ خیال گذرا کہ ان شعرا کے حالات زندگی کے بارے میں بھی اگر کچھ لکھ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے لیے انہوں نے بہت سے تذکرے مثلاً تذکرۂ تقی اوحدی، تذکرۂ نصرآبادی، کلمات الشعرا اور تحفہ سامی وغیرہ کا دقیق مطالعہ کیا اور جو کچھ ان کو بہتر اور مناسب معلوم ہوا اس کو انہوں نے لکھا اور اس طرح مجمع النفایس کی تکمیل کی۔

مجمع النفایس کی تکمیل کے بعد آرزو کی زندگی میں جو حالات پیش آئے ان کے بارے میں اطلاعات کے لیے ہمیں دو معاصر ماخذ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پہلا ماخذ باغ معانی ہے جس میں نقش علی رقم طراز ہیں کہ:

"..... و بعد کشتہ شدن نجم الدولہ ... بسمت صوبہ اودھ پیش رکن السلطنت عالی جاہ شجاع الدولہ بہادر کہ در آن زمان دایرۂ دولتِ ایشان در پایر گھات من مضافات صوبۂ اودھ بود، آمد. چون در آن ہنگام نواب بدفع ہنگامہ و اطفای نایرہ فتنۂ راجہ بنارس بلوند آن صوب عازم بودند در اثنای راہ در نالۂ کرہ کہ دو کروہی جونپور واقع است ..... از بہلی سواری بزیر افتاد استخوانِ پایش از جا بے جا شد و ضرب عظیم رسید. از الم آن تصدیع بسیار کشید. بعد مدتی شفا یافت. بعد یک سال

سنہ ۱۱۶۹ھ در لکھنؤ حیات مقدرش بنہایت انجامید...

... چون در سفر بنارس اتفاق فرود آمدن فقیر متصل الیشان واقع می شد بنا بر انس باین فن وار تباط بزرگان خیلی بر من شفقت می فرمود"(۱)

دوسرا ماخذ غلام علی آزاد بلگرانی کا خزانۂ عامرہ ہے جس میں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ:

" در ۱۱۳۲ھ گوالیار بدار الخلافۂ شاہ جہاں آباد آمد وصحبت او با آنندرام مخلص بنا بر جنسیت موزونی کبرا افتاد ..... مخلص برای او منصبی و جاگیری از سرکار بادشاہی گرفت و خدمت بسیاری از خود بتقدیم رساند بعد وفات موتمن الدولہ پسر نجم الدولہ نیز ......

صدو پنجاہ روپیہ در ماہہ می رساند و سوای این ہم رعایتہا می نمود. او بعد انتقال نجم الدولہ با سالار جنگ برادر خورد نجم الدولہ صحبت بر آرشد و ہمراہ او از دہلی قصد دیار شرقی کرد. و در اواخر محرم ۱۱۶۸ھ بعد ایام معدود از وفات صفدر جنگ ناظم صوبہ اودھ و صوبہ الہ آباد کہ ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ درگذشت بہ بلدہ اودھ کہ وطن اصلی جداو شیخ کمال الدین است، رسید...

... بعد ورود بلدہ اودھ بوساطت سالار جنگ باشجاع الدولہ خلف صفدر جنگ برخورد وسی و صد روپیہ در ماہہ مدد خرچ اواز سرکار شجاع الدولہ مقرر شد

---

(۱) نقش علی باغ معنی، ۱۱۷۴ھ

و چون وقت انتقال او قریب رسید به بلدهٔ لکھنو آمد
و ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۶۹ھ بجوار رحمت حق پیوست۔
اول اورا در لکھنو امانت گزاشتند و بعد چند گاہ بقیہ
جسد اورا به شاه جہان آباد بردہ دفن کردند(۱)

مجمع النفائس دو جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں مولف کو بہت محنت کرنی پڑی چنانچہ متوسطین و متاخرین کے تقریباً سو دیوانوں کو جن میں پانچسو سے لے کر چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) اشعار تک تھے پڑھ کر اس کتاب کو مرتب کیا۔ پہلی جلد میں آٹھ سو اڑتیس (۸۳۸) شعرا کا ذکر ہے جو بایزید بسطامی سے شروع ہوتا ہے اور میر محمد ماہ صداقت پر ختم ہوتا ہے۔ دوسری جلد اس کا تکملہ ہے اس میں آٹھ سو اٹھانوے (۸۹۸) شعرا کا ذکر ہے۔ یہ ملا صہبائی سے شروع ہوتا ہے اور محمد اشرف یکتا پر ختم ہوتا ہے

اس تذکرہ کی قدر و قیمت عام تذکروں سے اس حیثیت سے بہت زیادہ ہے کہ اس میں معاصرین اور غیر معاصرین کے کلام پر آرزو نے اصلاحیں بھی کی ہیں اور بعض جگہ اعتراضات بھی کیے ہیں مثلاً سرخوش کے ذیل میں ان کے اس شعر پر:

صاحب جوہر رفیق جوہر شود — استخوان ماہی آخر دستہ خنجر شود

آرزو کے نزدیک اگر دوسرا مصرعہ اس طرح ہوتا تو بہتر تھا:

عاقبت دندان ماہی دستۂ خنجر شود

---

(۱) خزانہ عامرہ، ۱۱۷۶ھ

قاسم بیگ :

چو بحشر گہ درآئی ہمہ ہمچو طفل مکتب　　فگنند نامہ ہا را زکف از پئے تماشا

آرزو کے خیال میں "بحشر گہ درآئی" کے بجائے "چوں بحشر اندر آئی" زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شفیعائی اثر :

چراغی از پئی حاجت زلالہ روشن کن　　ببوستان کہ قدم گاہ سبز پوشان است

آرزو کے نزدیک "لالہ" کے بجائے "جام" زیادہ مناسب ہے۔

چراغی از پئی حاجت زجام روشن کن

آرزو کا تذکرہ مجمع النفائس آرزو کو زندہ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہے یہ کتاب محض تذکرہ ہی نہیں بلکہ بہترین تنقید، بہترین ظرافت اور بلند پایہ شعر و ادب کا شاہکار ہے۔ اس میں تنوع اور چاشنی پائی جاتی ہے اس میں اسلاف کا بھی رنگ موجود ہے اور آیندہ آنے والی نسلوں کے لیے ہدایات بھی ہیں یہ وہ درمیانی کڑی ہے جو گزشتہ اور آیندہ ادب سے ہم کو روشناس کراتی ہے یہ ایک ایسا انقلابی کارنامہ ہے جو پرانی روش کی تخریب کے بعد نئی تعمیر کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی اور مستقبل کے ادب کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی طرز تحریر نہایت سادہ، سلیس، رواں اور دلکش ہے شعرا کی زندگی اور تصانیف پر آرزو کے نظریات و عقائد نہایت جامع ہیں۔

مجمع النفائس کا وہ خطی نسخہ جو کتابخانہ خدا بخش میں محفوظ ہے کامل ترین نسخہ ہے جس میں ایک ہزار سات سو پینتیس (۱۷۳۵)

فارسی شعرا کا تذکرہ ہے، اس میں شروع سے لے کر مولف کے وقت تک کے شعرا اور مصنفین کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ میں مولف کی شرح حال تفصیل سے درج ہے اور پھر آرزو نے خود اپنی ابیات نقل کی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے دوسرے نسخے انڈیا آفس، باولین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ دانشگاہ پنجاب و پٹنہ، رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں خدا بخش کے کتب خانے میں دو نسخے ہیں ایک ۱۱۷۹ھ/ ۶۶-۱۷ء اور دوسرا ۱۱۹۶ھ/ ۸۲-۱۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ دانشگاہ پنجاب میں دو نسخے ہیں، ان میں سے ایک مکمل ہے جو ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۸ء کا ہے یہ لکھنؤ میں مکمل ہوا۔ اور دوسرا نسخہ ناقص ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دو نسخے اودھ کے کتاب خانے میں تھے جن کا اسپرنگر کی فہرست میں ذکر ہے، اسپرنگر نے جن نسخوں کا ذکر کیا ہے اس میں شعرا کی تعداد ایک ہزار چار سو انیس (۱۴۱۹) لکھی اور اسی کو سراوسلے نے بھی لکھا ہے۔

متفرقات:

آرزو شرح، توضیحات اور خطوط کے مصنف ہونے کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تشریحات، توضیحات اور خطوط میں نظم و نثر دونوں کا استعمال ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والوں کے ذہنوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

پیام شوق:

یہ خطوط کا مجموعہ ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے دور کی ابتدا میں لکھا گیا۔ اس کا ایک نسخہ دانش گاہ پنجاب میں محفوظ ہے مصنف

کا انفرادی رنگ اس کی انشا میں بھی موجود ہے ۔

آداب عشق :

اس میں عشق کے معاملات پر بحث ہے ۔

گلزار خیال :

ہولی اور بہار کے موسم کا مفصل بیان ملتا ہے ۔

آبروئے سخن :

اس میں پہاڑوں اور حوض کے متعلق بیان کیا گیا ہے

رقعات آرزو :

یہ آرزو کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ہم عصروں کو لکھے تھے۔ آداب عشق ، گلزار خیال آبروئے سخن خطبے اور دیباچے اب نہیں ملتے ہیں ہوا رستہ سیا لکوٹی نے صفات کائنات (مطبوعہ) میں بنلا ہر خطبوں اور دیباچوں کا انتخاب دیا ہے

آرزو کی منثور و منظوم تالیفات پر نظر ڈالنے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ خان آرزو جیسا مجموعۂ فضائل اس دور میں کوئی اور نظر نہیں آتا ۔ ان کا شاعرانہ کلام اپنی کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے نہایت وقیع اور قابل توجہ ہے ، لیکن ان کا اصل میدان زبان شناسی ، فرہنگ نویسی اور دستور زبان ہے ، اور ان تینوں فنون میں آرزو کا کوئی ثانی نہیں ہے ، ان کی کتاب مثمر جو مزہر سیوطی کے مقابل لکھی گئی ، فارسی میں اپنے موضوع کے اعتبار سے تنہا تصنیف ہے مصنف نے سیوطی کے اصول کو فارسی میں رائج کیا ہے اور اس سے نہایت کامیاب نتیجے برآمد ہوئے ہیں ۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی ۔

فرہنگ نویسی اور فن لغت میں آرزو نہایت بلند مقام پر فائز ہیں، انہوں نے فارسی کی دو اہم فرہنگوں یعنی فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی کے درمیان محاکمہ کیا ہے اور یہ محاکمے مولف کی دقت نظری کی بین دلیل ہیں اس سلسلے میں ان کے دو کارنامے خصوصی توجہ کے حامل ہیں، اوّل یہ کہ انہوں نے توافق لسانین کا نظریہ قائم کیا، اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس سے قبل دنیا کے کسی کونے سے یہ آواز سنائی نہ دی تھی، انہوں نے فارسی اور سنسکرت کے الفاظ اور ان کے اصول اشتقاق کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ قائم کیا کہ ان دونوں زبانوں کی اصل ایک ہی ہے۔ یہی نظریہ آج تک قائم ہے۔ زبان شناسی کے میدان میں یہ اہم اضافہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندستان میں فارسی نے اپنا مقام بنایا تھا، کئی سو سال کے رواج نے اس زبان کا مزاج ہندی بنا دیا تھا اس ہندستانی فارسی کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے لیکن اہل ایران اس کی اہمیت بجا طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ خان آرزو کے معاصرین میں علی حزیں کافی شہرت کے مالک ہیں، انہوں نے ہندستانی فارسی شعرا کے کلام پر اعتراض کر کے ایران کی نہ صرف برتری بلکہ لاشرکت غیرا جارہ داری ثابت کرنے کی کوشش کی، اس کا جواب خان آرزو نے دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ ہندستانی فارسی کا الگ درجہ و مقام رکھتی ہے۔ اور اس کا بجا طور پر اعتراف کرنا چاہیے۔ خان آرزو کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مختلف شعرا کے درمیان محاکمہ کیا اور بعض شعرا کی زبان دانی کو

چیلنج کیا ہے، شعرا کے یہاں زبان، محاورے اور طریق استعمال کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ذیل میں ان کی مشہور تصنیف مثمر کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مثمر

خان آرزو مشرق و مغرب میں پہلے عالم ہیں جنھوں نے توافق لسانین کے نظریہ کو پیش کیا یعنی فارسی اور سنسکرت کے باہمی رابطہ اور تعلق کو۔ ان خیالات کو انھوں نے اپنی کتاب مثمر میں نہایت تفصیل سے واضح کیا ہے۔ ابھی تک اس کا مفصل جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ یہ کتاب درج ذیل اکتالیس (۴۱) اصلوں میں تقسیم کی گئی جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں ان اصلوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱-۱ اصل: در بیان معنی فارس و فارسی

۱-۲ اصل: در بیان زبان فارسی

۱-۳ اصل: در بیان آثار و احادیث کہ در حق زبان فارسی و فارسیان واقع شدہ

۱-۴ اصل: اول کسی کہ بفارسی شعر گفت

۱-۵ اصل: برائے ہر معنی لفظی معین لازم است یا نیست

۱-۶ اصل: لفظ گاہی موضوع شود برای شخصی بعینہ و گاہی باعتبار امر عام۔

۱-۷ اصل: الفاظ و مدلولات مناسب طبیعہ است

۱-۸ اصل: در طریق معرفت لغت۔

۱-۹ اصل: در بیان آنکہ از اہل زبان صادر شود یا نشود۔

۱۰۔ اصل ؛ در بیان استعمال لفظ بمعنی با تحقیق و یقین

۱۱۔ اصل : در بیان آنکه تصرف قادرسخنان هند در مفردات و مرکبات فارسیه جائز هست یا نیست۔

۱۲۔ اصل . لغات غیرمشهور که ثابت شواهد کلام استادان است)

۱۳۔ اصل . در اثبات معنی لغات ۔

۱۴۔ اصل : در بیان بعضی لغات که فارسی آن فراموش و عربیه آن مشهور ۔

۱۵۔ اصل : در معرفت افراد

۱۶۔ اصل : در معرفت فصیح

۱۷۔ اصل : در معرفت ردّی و مذموم

۱۸۔ اصل : در بیان مطرد و شاذ۔

۱۹۔ اصل : در معرفت الحواشی والغرایب۔

۲۰۔ اصل : در معرفت اختلافات لغات

۲۱۔ اصل :۔ در بیان اختلاف کیفیت تلفظ حروف

۲۲۔ اصل : در بیان حذف

۲۳۔ اصل : بدانکه نوعی از اختلاف است زیادة حروف در کلمه۔

۲۴۔ اصل : نوعی از اختلاف است قلب،

۲۵۔ اصل : در بیان ابداله

۲۶۔ اصل : در بیان اماله

۲۷۔ اصل : در بیان استعمال الفاظ غیرفارسیه در فارسی۔

۲۸۔ اصل : در بیان تصرف فارسیان در الفاظ زبانهای دیگر خصوصاً

عربی و ہندی ۔

۲۹۔ اصل : در بیان تصرف فارسیاں در ہندی ۔

۳۰۔ اصل : در توفیق الفاظ

۳۱۔ اصل : در بیان بعضی از مسایل و امثلہ کہ متعلق است بتعریب الفاظ فارسی

۳۲۔ اصل : توافق ۔

۳۳۔ اصل : در معرفت حقیقت و مجاز

۳۴۔ اصل : در معرفت مشترک ۔

۳۵۔ اصل در بیان مترادف

۳۶۔ اصل : در معرفت اتباع

۳۷۔ اصل : در معرفت اعراب

۳۸۔ اصل : در معرفت حروف

۳۹۔ اصل : در بیان کلمات غیر مفردہ کہ برای نسبت و جز آن در فارسی آید بہ ترتیب حروف تہجی ۔

۴۰۔ اصل : در معرفت بحث فی المزہر ۔

۴۱۔ اصل : در بیان امثلہ ۔

بعض اصلیں بہت طویل ہیں اور بعض نہایت مختصر۔ اصلوں کے تحت فصلیں ہیں جن میں متقدمین و متوسطین کے اسناد پیش کیے گئے ہیں۔ فصلوں کے علاوہ مخفی نماند، بشنو، نقل، فواید، تذئیل وغیرہ کے ضمن میں بھی کچھ چیزیں پیش کی گئی ہیں جو تحقیق الفاظ وحل لغات میں بہت کارآمد ہیں۔ یہ جلال الدین سیوطی کی کتاب مزہر[1] کے طرز پر لکھی

(۱) مزہر سیوطی میں پچاس نوع ہیں یہ دو جز میں شائع ہوئی۔ پہلے جز میں ۴۹ نوع اور دوسری میں ۱۱ نوع شامل ہیں ۔

گئی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ یہ کتاب عربی زبان میں عربی لغت سے متعلق ہے اور مثمر فارسی لغات کے اصول پر ہے۔ ابھی تک اس فن پر اس طرح کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے؛

بعد من معنی رسی خواہد گر بیست — گر نگرید کس کسی خواہد گریست

پہلی اصل:

مثمر کی پہلی اصل میں فارس و فارسی کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فارس پارس کا معرب ہے۔ بقول سعدی[1]

اقلیم پارس را غم از آسیب دھر نیست

فارسی لفظ فارس سے منسوب ہے اور بعض کتابوں میں مرقوم ہے کہ پارس پہلو بن سام بن نوح کا بیٹا ہے اور وہ اس عہد میں جس اطراف کا مالک ہو گیا تھا وہ اس کے نام سے موسوم ہو گیا اور زبان پارسی بھی اسی سے منسوب ہے پرانے زمانے میں پورے ایران کو پارس کہتے تھے اور اس ملک میں جو زبان بولی جاتی تھی اس کو پارسی[2] کہتے تھے اور فارسی اس کا معرب ہے۔ اس تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ کہ فارسی فارس سے ہی ماخوذ ہے۔

دوسری اصل:

اس اصل میں فارسی زبان سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس میں وہ آثار و احادیث بھی نقل کی گئی ہیں جو زبان فارسی اور فارسیوں

---

(۱) دیباچہ کلیات سعدی، چاپ جاویدان ص ۷۰:

اقلیم پارس را غم از آسیب دھر نیست — تا بر سرش بود چو توئی سایۂ خدا

یا معرفت لغت سے متعلق ہیں مصنف کا کہنا ہے کہ فارسی کی سات قسمیں ہیں جن میں سے چار متروک[1] الاستعمال ہیں کیوں کہ اس میں کتاب اور خط نہیں لکھے جاسکتے ہیں۔ وہ سات قسمیں یہ ہیں۔

ھروی

سگزی

زاولی

سغدی

اور دوسری تین زبانیں

فارسی

دری

پہلوی

آخر الذکر تین زبانوں میں تحریری آثار موجود ہیں اور شعر بھی مل جاتے ہیں بقول انجوی شیرازی،

"و آن زبانی است کہ در بلاد پارس کہ دار الملک آن استخر است بدان سخن کنند و استخر اول شہریست کہ کیومرث بنا کردہ و در عہد پیشدادیان بغایت آبادانی رسیدہ بود"[2]

بقول خان آرزو زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے ایران کے مختلف خطے کے لوگ مختلف طرح سے تلفظ کرتے ہیں ان کے لکھنے پڑھنے

(۱) مقدمہ جہانگیری ص ۱۴۔ ۱۵

(۲) ایضاً ص ۱۵

کی زبان فارسی ہی ہے۔ اور تمام ایرانی فارسی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں لیکن ہر خطے کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے، شیراز کی اور ہے قزوین وگیلان و خراسان کی اور کاشان کی اور۔ سعدی:

پیر ہفتاد سالہ چنی مکنہ	کور مقری جنی منی چش روشن (1)

(۷۰ سال کی بڑھیا جو کہ جوانی محسوس کرتی ہے وہ مادر زاد اندھی ہے کہ خواب میں کبھی چشم روشن کو نہیں دیکھ سکتی ہے)

(2) میر یحیی کاشی جو کہ شیرازی الاصل ہیں اہل کاشان کی مذمت میں کہتے ہیں:

امتیاز قمی و کاشانی	این بود وقت گوهر افشانی
کہ قمی واکند بعرض دهن	کاشش آید بطول لب سخن
آنکہ در فارسی شده است مثل	الف و نون کند بواو بدل
کرده در نحو عرض مطلب شان	فتحه را ضمه عامل لب شان
فارسی چون (3) کند سر علما	آن چنان وآن چنون بود همه جا
شعرا چون شوند قافیه سنج	می توان یافت از گهر صد گنج

(1) یہ بیت سعدی کی کلیات کے کسی نسخے میں نہیں ملی اس لیے اس کی تصحیح ممکن نہ ہو سکی۔

(2) سرو آزاد: ص ۸۵، ۸۶: میر یحیی کاشی متوفی ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء شاہجہاں کے عہد میں ہندستان آئے اور شاہ جہان آباد کے قلعے کی بنیاد کی تاریخ کو اس طرح لکھا: "شد جہاں آباد از شاہ جہان آباد" ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء

(3) مجمع النفائس خطی ص ۴۰۵: سر کنند چوں علما۔

همه[1] اول بود شراب و کباب ضمه دارد بلسان لفظ حباب
بیدها بود و بود ها بیداست ریدها رود و رودها ریداست
رودخانه زنثر[2] گفتاری ریدخانه است بر زبان جاری[3]

ان ابیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر جگہ جہاں پر الف و نون ہوتا ہے وہاں پر کاشی یا کاشانی واو بولتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر کاشیوں یا کاشانیوں کے لیے ہی مخصوص ہوگیا ہے لیکن آج کل اہل عراق و شیراز وغیرہ بھی اسی طرح بولتے ہیں وہ دکان کو دکون او جان کو جون کہتے ہیں، بقول مخلصای کاشی:

کار معجون کمونی می کند پیکان او

یہاں کمان کو کمونی سمجھا اسی وجہ سے معجون کمونی استعمال کیا اور شعر کے لطف کا مدار اسی پر رکھا لیکن سوال یہ ہے کہ جب کمان کو کمون بنایا تو پیکان پیکون ہونا چاہیئے تھا اور یہ فصحا کے محاورہ کے مطابق غلط ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر آرزو محض انہیں ایرانی اساتذہ کا کلام مستند سمجھتے ہیں جو خود عالم و فاضل ہوں اور مرکبات سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں۔

دوسری زبان دری ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ بلخ[4] یامی، مردشہہان[5]

(۱) مجمع النفائس همه جا اولش شراب و کباب
خطی ص ۴۵:
(۲) ایضاً: شسته

(۳) برہان ص ۸۴۷: جمعی گویند لغت ساکنان چند شہر بوده است که آن بلخ و بخارا، بدخشان و مرو است: یہی قول آرزو کی سراج اللغۃ ورق ۲۷ پر ہے لیکن متن میں یہ فرق اس لیے ہے۔ کیونکہ بدخشاں کو قول اول سے جدا کرتا ہے۔
(۴) جہانگیری ص ۱۶: مرو و مرو شہہان ایک ہی ہے۔ اس جگہ کے لوگ جیسے
(باقی آئندہ)

اور بخارا کے لوگ اس زبان میں مکالمہ کرتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے
دری بدخشاں کے لوگوں کی زبان ہے اور کچھ صاحبان نظر اسے
کیانی دربار کی زبان بتاتے ہیں۔

ان تینوں زبانوں میں سے تیسری[۱] زبان پہلوی ہے، پہلو
پارس کے باپ کا نام ہے اور پہلو کو پہلہ سے منسوب کیا ہے
پہلہ رے[۲]، اسپہان، اور دینور[۳] کو ملا کر کہتے ہیں۔ پہلو اور شہر کو ہم
معنی بتایا ہے۔ فردوسی کہتے ہیں[۴]:

ز پہلو بروں رفت کاؤس شاہ　　　ز ہر سو ہمی گشت گرد سپاہ[۵]

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر وہ لفظ جو کہ کیان کے پایہ تخت کے پہلوان
بولا کرتے تھے اس کو پہلوی کہتے ہیں۔ مثمر کے مصنف کا کہنا ہے کہ پہلوی کو
پہلوانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ فردوسی:

اگر پہلوانی ندانی زبان　　　بتازی تو اروند را دجلہ خوان[۶]

بقیہ ص (۱۶۳)
عباس مروزی معروف ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ مرو شہجان مرو الرود
سے جدا ہے اور دونوں کے درمیان ۷۴ میل کا فاصلہ ہے۔

---

(۱) جہانگیری ص ۱۷۔

(۲) رے تہران کے نزدیک ایک قدیم شہر ہے۔ اس جگہ ابو بکر زکریا رازی
اور فخر الدین رازی وغیرہ مشہور علما گزرے ہیں۔ اب یہ ایک صرف چھوٹا
سا شہر باقی رہ گیا ہے۔ (۳) نزہت القلوب چاپ بریل ص ۱۰۷، در
بقاع کردستان شہریست از اقلیم چہارم طولش از جزائر خالدات پنج و عرض
از خط استوا۔ شہری کوچک است و ہوائش معتدل و آبش فراوان، و از آن
جا ابو حنیفہ دینوری است (۴) فردوسی متوفی ۴۱۱ھ ۱۰۲۰ء یا ۴۱۶ھ ۱۰۲۵ء
(۵) مقدمہ جہانگیری ص ۱۷۔ [illegible] صفحہ

ان دونوں زبانوں کی تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دری درہ کوہ کے لوگوں کی زبان ہے اور پہلوی شہر اور پہلو کی زبان ہے۔ اب یہ تحقیق پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ دری اور پہلوی کے معنی ایک ہی ہیں۔ کیونکہ دری اس زبان سے عبارت ہے جو کہ بادشاہ و سلاطین کے دربار پر بولی جاتی ہے۔ اور پہلوی پہلو یعنی شاہی لشکر یا شاہی خیموں کی زبان سے عبارت ہے۔ اس طرح دونوں زبانیں ایک ہی ہیں۔

تیسری اصل :

یہ اصل ان احادیث سے متعلق ہے جو فارسی زبان اور اہل ایران کی تعریف میں ملتی ہیں۔ اس میں آرزو نے فرہنگ جہانگیری سے ہو بہو مطالب لے کر پیش کیے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ آرزو نے فتح الباری کو شیخ ابن الہمام سے منسوب کیا ہے جبکہ جہانگیری میں ابن حجر اسقلانی سے منسوب ہے۔

چوتھی اصل :

اس اصل میں جو بحث کی گئی ہے وہ دبستان المذاہب پر مبنی ہے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے جس نے شعر کہا وہ آدم علیہ السلام تھے۔ قابیل کے بیٹے سے مرثیے کے اشعار منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ

بقیہ صفحہ ۱۶۴

(۱) جہانگیری ص ۱۶۱ ج ۲، صحاح الفرس ص ۲۷۳، اروند دو معنی دارد اول رود دجلہ را می خوانند دوم کوہ الوند است۔

(۱) لباب الالباب، باب سیوم : در معنی آنکہ اول شعر کہ گفت۔

فارسی شاعری کی تاریخ میں بہرام گور[1] اور کچھ عمرو لیث[2] کے بیٹے کی طرف بھی اشعار منسوب[3] کرتے ہیں لیکن دبستان المذاہب[4] سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبادیان کے عہد میں بھی، جو شادیان سے پہلے گذرے ہیں، شعرا موجود تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فرہوشں نامی بادشاہ آبادیان کے عہد میں تھا۔ اس کے دربار میں بے شمار شعرا موجود تھے اور سات شاعروں میں سے ہفتہ میں ہر روز ایک شاعر بادشاہ کے سامنے اپنی نظم پیش کرتا تھا اوستا اور زرتشتیوں کے متعلق آرزو کی معلومات بھی بہت زیادہ قابل اعتبار نہ تھیں۔

---

(۱) لباب الالباب باب چہارم: در معنی اول کسی شعر پارسی کہ گفت: روایت شعریہ ہے

منم آن شیر گلہ منم آن پیر یلہ　　　نام من بہرام گور کنیتم بو جبلہ

تاریخ ادبیات ایران، ص ۱۴۸ و بعد

(۲) عمرو بن لیث ایران میں حکومت صفاریہ کے بانی یعقوب لیث کا بھائی تھا یعقوب کی وفات کے بعد ۲۶۵ھ / ۸۷۸ء میں تخت پر بیٹھا اور ۲۸۷ھ / ۹۰۰ء تک حکمران رہا صفاری حکومت ۳۹۳ھ / ۱۰۰۲ء میں محمود غزنوی کے ہاتھوں میں پہنچ گئی

(۳) بظاہر یہ غلط ہے کیونکہ یہ واقعہ یعقوب بن لیث صفاری سے منسوب ہے جیسا کہ سرو آزاد میں صفحہ ۱۳ پر بھی اس کا ذکر ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ یعقوب کے عہد میں معروف شعرا مثلاً محمد بن وصیف سگزی، سام گودرز، محمد بن مخلد ہوئے ہیں ان کے کچھ اشعار اب بھی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ سیستان و تاریخ ادبیات در ایران ج ۱ ص ۱۴۴، ۱۵۸، ۱۹۴، ۲۱۱، ۲۱۲، بعد۔ لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ آرزو نے عباس مروزی کے مشہور قصیدے جو کہ مامون کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ جس کا ذکر لباب الالباب عوفی میں ملتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ اس قصیدہ کو مامون سے نسبت دینا بالکل غلط ہے۔ ملاحظہ ہو بیست مقالہ قزوینی، ج ۱، (۴) دبستان المذاہب جس کو کچھ لوگ ملا محسن کشمیری سے منسوب کرتے ہیں

پانچویں اصل:

اس اصل میں مصنف کہتے ہیں کہ ہر معنی کے لیے الگ الگ لفظ ہونے چاہئیں۔ امام فخر رازی(۱) کا کہنا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر معنی کے لیے الگ لفظ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا مصنف بھی اس بات پر راضی ہے کہ امام کا کہنا درست ہے اس کے لیے انہوں نے فارسی کے الفاظ کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔

چھٹی اصل:

اس اصل میں آرزو نے ان مسئلوں سے بحث کی ہے جن کو عضد الدین ایجی نے اپنے رسالے مواقف میں بیان کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کبھی لفظ شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کی خصوصیات کے لیے جو عام آدمیوں اور چیزوں میں پائی جاتی ہیں۔

ساتویں اصل:

اس میں آرزو نے ان مسئلوں سے بحث کی ہے جن سے عباد بن سلیمان الصیمری معتزلی نے بحث کی تھی۔ عباد کے مطابق لفظوں اور ان کے مفہوم میں قدرتی مناسبت ہوتی ہے کسی شخص سے پوچھا کہ اذغاغ کیا ہے اور کیا فارسی میں سنگ کو اذغاغ کہتے ہیں۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ خشکی میں زیادہ ہوتا ہے

۱۔ مزھر ص ۲۲، المسئلۃ السادسہ

"قال الامام فخر الدین الرازی واتباعہ لا یجب ان یکون لکل معنی لفظ لان المعانی التی یمکن ان تعقل لا تتناھی والالفاظ متناھیۃ لانھا مرکبۃ من الحروف والحروف متناھیۃ والمرکب من المتناھی متناہ والمتناھی لا یضبط ما لا یتناھی والا لزم تناھی المدلولات فالو قوا المعانی منہا (باقی ص ۱۶۸)

اور سوچتا ہوں کہ وہ سنگ[1] ہی ہے۔ لیکن فارسی کی معتبر کتابوں میں ازغاغ سنگ کے معنوں میں نہیں ہے۔ اور متاخرین کے یہاں بھی ان معنوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ بعض جگہ اس کو تبریز کا لفظ کہا جاتا ہے جیسا کہ اصفہانی نے منہاج قاضی بیضاوی کی شرح میں لکھا ہے عربی لغت کے عالموں نے ثابت کیا ہے کہ الفاظ اور معانی کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ آرزو کے قول کے مطابق بھی لفظوں اور معنوں میں فرق ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی امر پایا جاتا ہے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کی آواز ایک جیسی ہے مثلاً غرغرہ جس کے معنی پانی کو گلے میں اس طرح گھمانا ہے کہ وہ حلق کے اندر نہ جائے، قرقرہ شراب کی آواز گلے کے اندر، قہقہہ آواز کے ساتھ ہنسنا۔ اس کی مثالیں مزھر میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

آٹھویں اصل :

اس اصل میں آرزو نے اس علم کو بیان کیا ہے جس کے ذریعے الفاظ کو سمجھا جاسکتا ہے یہ بحث امام فخر الدین رازی[2] کی کتاب

بقیہ ص ۱۶۷

۱۔ مزہر ص ۲۶، س ۳ سے ۷ تک: (المسئلة العاشرة) نقل اهل اصول الفقه عن عباد بن سلیمان الصیمری من المعتزلة انه ذهب الی ان بین اللفظ ومدلوله مناسبة طبیعیة حاملة للواضع علی ان یضع قال والا لکان تخصیص الاسم المعین بالمسمی المعین ترجیحاً من غیر مرجح وکان بعض من یری رایه یقول انه یعرف مناسبة الالفاظ لمعانیها فسئل ما مسمی اذغاغ وهو بالفارسیة الحجر فقال اجد فیه یبساً شدیداً

(۲) مزہر ص ۲۹-۳۰، س ۲۵-۲۶، المسئلة الثانیة عشرة فی الطریق الی معرفة اللغة قال امام فخر الدین الرازی فی المحصول واتباع الطریق الی معرفة اللغة اما النقل المحض کاکثر اللغة او استنباط العقل من النقل کما اذا نقل الینا ان الجمع المعرف یدخله الاستثناء ونقل الینا ان الاستثناء اخراج ما تناوله اللفظ فحینئذ یستدل بهذین النقلین علی ان صیغ

باقی ۱۶۹ پر

محصول پر مبنی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ اس اصل میں لکھا ہے سب عربی الفاظ کے طریقے پر ہے اور چونکہ دین عربی زبان میں ہے اس لیے احتیاط مجبوراً لازم ہے۔ بقول آرزو کہ فارسی لغت کا طریقہ اور رویہ کبھی رہی ہے کیونکہ قدیم الفاظ جو فرہنگوں میں موجود ہیں، ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ اگر اہل زبان سے پوچھے جائیں تو وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایران و توران نے فرہنگیں لکھیں اور قیاس کے مطابق ان کے معنی بھی لکھے اور بہت سی جگہ غلطیاں بھی کیں۔ ان کی غلطیاں کبھی کبھی سننے یا لکھنے سے معلوم بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ غلطیاں ان لوگوں سے ہو جاتی ہیں جو اس زمانے میں اپنی استادی کا دعویٰ کرتے ہیں اور استادوں کی مخالفت کے باوجود فن شعر میں اپنے کلام کو مستند مانتے ہیں۔ اہل ایران[2] میں کسی سے پوچھا گیا کہ سلیم[3] کے اس شعر میں "نرگسی زن" کے کیا معنی ہیں:

سرو چون سایہ زپی آمدہ رفتار ترا
نرگسی زن شدہ گل گوشۂ دستار ترا

بجمع للعموم و۲ ما العقل الصرف فلا مجال لہ فی ذلک والنقل المحض ما تواتر واحاد"۔ (۲) یہاں اہل ایران سے مراد علی حزین اصفہانی ہے ایک مثنوی خطی ص ۴۳۴ (۳) چراغ ہدایت ص ۴۷۴-۴۷۵

انہوں نے جواب دیا کہ "نرگسی زن" دستار کے باندھنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ بیت مذکور میں اس معنی سے کوئی ربط نہیں ہے شفائی[1] کی یہ بیت حقیقت میں وجہ صحت نہیں رکھتی ہے:

در لغل نرگسی زنان شجرہ　　آن نہالِ سیہ دلی ثمرہ

یہ بیت ایک گروہ کی مذمت[2] میں ہے جو کہ سید نہیں تھے لیکن اپنے آپ کو سیّد مانتے تھے دوسری ابیات[3] بھی جو یہاں نہیں لکھی جا رہی ہیں اسی سے متعلق ہیں۔

اسی اصل میں آرزو نے بتایا ہے کہ الفاظ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مفردِ مشہور مثلاً اسپ، خر، گفت، شنید اور دوسرے مفرد غیر مشہور جیسے دست و پا وغیرہ۔ ان کا استعمال اکثر قدما کے کلام میں ہوا ہے اور اکثر ان کے معنی میں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً "بناغ" فرہنگ رشیدی[4] میں ریسمان خام کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن دوسرے صاحبانِ فرہنگ کی نظر میں دبیر اور منشی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بیت منصور شیرازی کا ملاحظہ ہو۔[5]

۱۔ چراغ ہدایت ص ۴۷۴ - ۴۷۵

۲۔ یہ بیت خرد کلہ کے لوگوں کی مذمت میں ہے جو کہ سید نہیں تھے لیکن خود کو سادات میں سے کہتے تھے۔ چراغ ہدایت ص ۴۷۴ - ۴۷۵ -

(۳) چراغ ہدایت ص ۴۷۴ - ۴۷۵۔ طغرا کی دو بیت اور تاثیر کاشی کی دو بیت نقل ہوئی ہیں۔ (۴) فرہنگ رشیدی ص ۴۴۳ ج ۱۔

(۵) فرہنگ جہانگیری ص ۱۷۶۶۔

ضمیر تو[1] بود آن بلبلی کہ گاہ بیان ‫ ‫ بہ پیش او بود ابکم زبان تیز بناغ

مرکبات تامہ وغیر تامہ مثلاً قلب صفت و موصوف ا جو کہ اکثر استعمال ہوا ہے اور سب اہل زبان اس کو صحیح مانتے ہیں جیسے

چہ علی خواجہ و چہ خواجہ علی

قلب مضاف و مضاف الیہ مثلاً "گیہان خدیو" ، "خدا بندہ" "فربند" وغیرہ لیکن "اسپ زید" کا "زید اسپ" صحیح نہیں ہوگا۔

نویں اصل:

اس اصل میں مولف نے اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اہل زبان سے غلطی ہوسکتی ہے یا نہیں. یہ بات مسلمہ طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اساتذہ کے یہاں صرفی و نحوی غلطیاں موجود ہیں مثلاً کبھی وزن میں کبھی قافیہ میں، کبھی تقدیم و تاخیر میں اور کبھی افعال غلط پائے جاتے ہیں جیساکہ سعدی[2] کی یہ بیت:

تو نیکو روش باش تا بدسگال ‫ ‫ بنقص تو گفتن[3] نیابد مجال

بعضوں نے اس کو تعقید لفظی کے زمرہ میں رکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ تعقید لفظی اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ قلت الاستعمال ہو، اور اس جگہ ایسا نہیں ہے. تعقید مرکب الفاظ میں ہوتا ہے اور کبھی کبھی مفرد الفاظ میں بھی ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک

---

(۱) جہانگیری ص ۱۷۶۶:

(۲) جہانگیری ص: ۱۵۶۸۔

(۳) ایضاً: بہ بد گفتن تو.

ایسے ایرانی شاعر کا شعر جو ہندستان آئے تھے :

غمگیں نمی رود کسی از خاک میکدہ　　تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی رود

آرزو کی رائے میں لفظ غمگین کی وجہ سے شعر کا مطلب خبط ہو گیا اگر اس کے بجائے ہرگز کر دیا جائے تو معنی صحیح ہو جائیں گے :

ہرگز نمی رود کسی از خاک میکدہ　　تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی رود

ملا نازکی کا شعر بھی ملاحظہ فرمائیں :

انا قہ نفر قش چو دم رباہ　　ابر فرق اویک کیانی کلاہ

روباہ کو وزن برقرار رکھنے کے لیے واؤ کے بغیر استعمال کیا ہے اور یہ محاورہ کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے حافظ اور سعدی کے اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔

دسویں اصل :

مولف نے اس اصل میں لفظ کا صحیح استعمال، ان الفاظ کے تحقیقی معنی اور ان کے تعین سے بحث کی ہے۔ مثلاً لفظ سفید کا حسن

۱۔ یہ شعر حزین کا ہے ملاحظہ ہو ریاض الشعراء والہ داغستانی، ورق ۱۰۵ - ۱۰۷ : لفظ غمگین دریں جا طرفہ افادۂ می کند زیراکہ تا کسی راہم پیالۂ ماہ عید نمی کنند از خاک میکدہ غمگین نمی رود و بعد از آن کہ کردند غمگین می رود۔ در این مقام لفظ ہرگز می بایست نہ غمگین وگویا این سہو الفکر است۔

کشمیر اور سبز ینہ کا گجرات کے خوبصورت لوگوں پر اطلاق اس وجہ سے کہ دونوں جگہ کا حسن سفید اور سبز ہوتا ہے جبکہ ہندستان میں اکثر اطراف کے لوگوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے فارسی دانوں کا یہ خیال ہے کہ پورے ہندستان کا حسن سیاہ ہوتا ہے مثلاً ملا تشبیہی کاشی کہتے ہیں:

شد از ملک عراق آوازہ، تشبیہی خدا داند
سیاہان دکن کشتند یا سبزان کشمیری

چونکہ حسن کشمیر سفید ہوتا ہے اور سیاہ حسن وہاں نادر و نایاب ہے۔ چنانچہ ملا طاہر[1] غنی کشمیری کہتے ہیں:

کشمیر[2] در صباحت روشن گر جہاں است
حسن سیاہ آنجا گر ہست خال خال است

اسی ضمن میں ملا طغرا کہتے ہیں:

سبزینۂ گجرات بین گل از رخ او مات بین
شیرینی حرکات بین کز سرو ما یا زآمدہ

گیارہویں اصل:

اس اصل میں اس مسئلے سے بحث کی گئی ہے کہ کیا ہندستانی فارسی علما الفاظ، محاورات، مفردات اور مرکبات میں جو تبدیلی کر لیتے ہیں وہ درست ہے یا نہیں۔ مؤلف کا کہنا ہے کہ جب فارسی

۱۔ دیوان غنی کشمیری ص ۱۱۴

۲۔ دیوان: اند

زبان دانوں (ایرانیوں) نے عربی الفاظ میں تصرف کو جائز قرار دیا ہے جیسے لفظ "می سیر" بمعنی سیر کر، "تمیزد" بمعنی امتیاز کر جیسا کہ ملا عرفی وغیرہ کے یہاں استعمال ہوا ہے اسی طرح "طلوعیدن" اور "بلعیدن" بعض کے کلام میں آیا ہے، فارسی الفاظ کو بھی عربی کے قاعدے کے مطابق مثلاً "انا الیار" "ذوالخورشیدین" تلفظ کیا ہے تو پھر ہندستانی فارسی عالم کے لیے تصرف کرنا کیوں نہ جائز ہو، جبکہ یہ تصرف طلبیدن، فہمیدن اور غارتیدن کی طرح نہیں ہیں جو کہ عام ایرانی کرتے ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے مزہر[1] میں بیان کیا ہے کہ بہت سے عربی علما فارسی سے عربی الفاظ کا بنایا جانا غلط بتاتے ہیں۔ اگر امیر خسرو "کیسہ" کے بجائے "گرہ" استعمال کرتے ہیں تو آرزو کے نزدیک ان کا یہ عمل بالکل صحیح ہے، جیسے کہ اس بیت میں[2]:

ادمی رود بناز و گرہ می زند بزلف   مردن مراست، از گرہ او چہ می رود[3]

اگرچہ فارسیوں کے یہاں محاورہ "از کیسہ او چہ می رود" ہے۔ ان دو اصلوں کی مزید تفصیل آرزو نے اپنے رسالے داد سخن[4] میں لکھی ہے

بارہویں اصل:

اس اصل میں مولف نے ان تصانیف سے روشناس کرایا ہے جن سے اس نے مثمر میں استفادہ کیا۔ ان کتابوں کا تفصیلی تعارف بھی کرایا ہے۔ آرزو نے اس جد وجہد کی طرف اشارہ کیا ہے جو انہوں نے الفاظ کے قابل اعتماد معنوں کے تعین کرنے اور روزمرہ کی بول چال

---

(۱) مزہر ص ۱۳۸، س ۱۲-۱۴، یہ قول ابوبکر محمد بن السری کا ہے۔ من اشتق الاعجمی المعرب من العربی کان کمن ادعی ان الطیر من الحوت" (۲) دیوان خسرو چاپ نول کشور ۱۹۶۷ ص ۳۲ (۳) دیوان: جان می رود ز من، چہ گرہ الخ (۴) داد سخن، تالیف سراج الدین علی خاں آرزو

اور عامیانہ الفاظ کے سلسلے میں کی۔ اس کے علاوہ اس میں ان غیر مشہور لغات کو جو اساتذہ کے یہاں مستعمل ہیں اس کی طرف بھی دھیان دلایا۔ مولف کا کہنا ہے ایسے الفاظ جو غیر مشہور ہیں اور جن کو استادوں کے کلام ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے صرف جہانگیری میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر جامع اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولف جہانگیری جمال الدین حسین انجوی شیرازی نے جلال الدین اکبر بادشاہ ہند کے عہد سے اس کو لکھنا شروع کیا اور نورالدین جہانگیر کے عہد میں مکمل کیا۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت مولف کے زیر مطالعہ ۴۴ فرہنگیں تھیں جن کے نام اس نے اپنی تالیف میں لیے ہیں۔ ان کے علاوہ ۹ دوسری کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام جمال الدین

آرزو کو مقدمہ تحشیہ، تصحیح اور تالیفات کے ساتھ ڈاکٹر سید محمد اکرم نے اسلام آباد سے ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں شایع کیا لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اہم رسالہ میری نظر سے نہیں گذرا ملاحظہ ہو راہنمای کتاب ص ۳۴۸ شمارہ ۴-۶ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء امر، سے منقول ہے:

"در حلو سخن در نقد شعر در شبہ قارہ ہندستان و پاکستان نوشتہ شدہ است. محمد جان قدسی مشہدی متوفی ۱۰۵۶ھ کہ در عہد شاہجہان می زیستہ قصیدہ در منقبت حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام سرودہ کہ مطلعش این است:

یا عالم از نالۂ من بی تو چنان تنگ فضاست — کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

شیدا فتحپوری متوفی ۱۰۴۲ھ) معاصر قدسی قصیدہ او را انتقاد نمودہ، منیر لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ نیز نظر خود را در مورد قصیدۂ قدسی و شیدا بہ ہمان وزن و قافیہ سرودہ است آرزو در سخنان سہ شاعر مذکور داوری کردہ است

کو معلوم نہ تھے۔ اس کے علاوہ تفسیریں، تاریخیں، زند و پا زند اور دوسری کتابیں، شعرا کے دواوین جن کے اشعار شواہد کے طور پر اس میں نقل ہوئے ہیں۔ آرزو نے اکثر الفاظ کی تشریح قدیم فارسی کی طرح کی ہے مثلاً تفسیر زاہدی[1] میں صابئین کو نغوشاک سے تفسیر کیا ہے۔ پھر تفسیر حسینی[2]، تفسیر کبیر[3] میں صابئین کو نغوشاک کے معنی میں ہی پایا۔ اسی طرح وہ الفاظ جو دواوین

۱۔ تفسیر زاہدی یا تفسیر زاہد درواجکی سیف الدین فخر الاسلام ابو نصر احمد بن حسن بن احمد بن سلیمان زاہد درواجکی یا دلدرانی کی تالیف ہے ان کا انتقال ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء میں ہوا۔ یہ تفسیر سیف الدین لطایف التفسیر جواہر النفس کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ملاحظہ ہو مرکزی دانشگاہ تہران ج ۱، ص ۱۶۲۲

(۲) مقدمہ رسالۃ العقلیۃ فی الاحادیث النبویۃ: دائرۃ المعارف فارسی ج ۱ ص ۸۵۱ میں تفسیر حسینی کو کاشفی کے نام سے یاد کیا ہے۔ کمال الدین حسین بن علی کاشفی اہل بیہق کے واعظوں میں سے تھے۔ انہوں نے ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔ ان کی تصنیف میں جواہر التفسیر، مواہب علیہ، انوار سہیلی، مخزن الانشاء، اخلاق محسنی، روضۃ الشہدا اور اختیارات نجوم وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ تفسیر کبیر یا مفاتیح الغیب کے مصنف ابو الفضل محمد بن عمر الحسین معروف بہ فخر رازی ہیں۔ ان کے خاندان والے ۲۵ رمضان ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء میں طبرستان سے ری آئے اور یہاں فخر رازی پیدا ہوئے۔ یہ مذہباً شافعی تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں وہ ۶۰۶ھ / ۱۲۰۹ء میں فوت ہوئے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ الرسالۃ الکمالیۃ الحقایق الالٰہیۃ۔

اور امراض کے لیے استعمال ہوئے ہیں ان سے ذخیرۂ خوارزم شاہی[1] اور اختیارات بدیعی[2] کی طرف رجوع کیا اور ہر اس لفظ کی وضاحت کے لیے جو ملکوں، قصبوں وغیرہ کے سلسلے میں تھے۔ حمداللہ متوفی کی نزہت القلوب[3] اور عجائب البلدان[4] سے رجوع کیا۔

بسی رنج بردم بسی نامہ خواندم زگفتار تازی و از پہلوانی

۱- ذخیرۂ خوارزم شاہی فارسی زبان میں طب کی کتاب ہے۔ جس کے مصنف اسماعیل جرجانی نے ۵۳۱ھ/۱۱۳۶ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اس کتاب کو قطب الدین محمد خوارزم شاہ کے نام تالیف کیا۔ یہ طب پہ فارسی زبان میں یقیناً پہلی کتاب ہے۔ ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف ج ۱، ص ۱۰۲۸۔

(۲) اختیارات بدیعی فارسی کی لغوی اور طبی کتاب ہے۔ اس کے مولف علی بن حسین انصاری معروف بہ حاجی زین عطار ہیں۔ یہ کتاب ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء میں دو جلدوں میں شایع ہوئی۔ پہلی جلد میں دواؤں اور گھاس پھوس کے مفرد نام ہیں اور دوسری میں دواؤں کے مرکب نام ہیں۔ ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف فارسی ج ۱، ص ۶۷۔

(۳) نزہت القلوب کو حمداللہ متوفی نے ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں تالیف کیا ہے اس کے مصنف خواجہ رشید الدین فضل اللہ کے تابع تھے اور ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں اسی وزیر کے حکم سے قزوین، زنجان، ابہر اور طارمین کے مالی امور کی پیشکاری حاصل ہوئی۔ وہ شروع جوانی سے ہی دانشمندوں کی مصاحبت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ رشید الدین کی مجلس سے مستفیض ہوئے۔ ان کی تصنیفات میں تین کتابیں تاریخ گزیدہ، ظفر نامہ اور نزہت القلوب پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نزہت القلوب ص ۴۔

(۴) یہ کتاب ابو المؤید بلخی سے منسوب ہے اس کا موجودہ دستیاب نسخہ جدید تحریر میں ہے۔ اس کتاب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر یا پانچویں صدی ہجری کے

باقی آئندہ

اس اصل میں جن کتابوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے یہاں ان کا مختصر نام لکھنا ہی کافی ہے مثلاً ابوحفص[1] سغدی، اسدی[2] طوسی حافظ اوبہی[3] صاحب تحفۃ الاحباب نیازی[4] بخاری صاحب جامع اللغات[5] احمد منیری[6] صاحب شرف نامہ شیخ ابراہیم بلخی[7] بہاری

(بقیہ صفحہ ۱۷۷) اوائل میں شہرت پائی۔ اس کتاب کا ذکر تاریخ سیستان میں کئی بار ہوا ہے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات در ایران ج ۱، ص ۶۱۸

---

۱. حکیم ابوحفص سغدی سمرقند کے رہنے والے تھے یہ تیسری صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ فارسی کا پہلا شعر ان سے ہی منسوب کیا جاتا ہے۔

آہوی کوہی در دشت چگونہ دودا   او ندارد یار بی یار چگونہ رودا

ابوحفص کو صنائع موسیقی میں کمال حاصل تھا ملاحظہ ہو لغت نامۂ دہخدا ص ۴۲۸

(۲) اسدی طوسی۔ گرشاسپ نامہ کے مولف ہیں انہوں نے ۴۵۸ھ/ ۱۰۶۵ء میں ایک فرہنگ لغت فرس کے نام سے تالیف کی۔

(۳) حافظ اوبہی کی فرہنگ دسویں صدی ہجری کے نیمۂ اول میں لکھی گئی

(۴) پہلے ان کا گذر ہرات میں ہوا جہاں شاہ محمد ناصری فن موسیقی کے استاد سے استفادہ کیا۔ رک ہفت اقلیم ص ۴۳۶، ج ۳۔

(۵) احمد منیری عارف اور صوفی تھے یہ شیخ شرف الدین احمد بن یحیی منیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کو منیری اس لیے کہا جاتا تھا کیونکہ یہ شہر منیر کے رہنے والے تھے جو رود خانہ سون کے پاس ہے۔

(۶) ابراہیم قوام فاروقی کا ایک لغت نامہ جس کو فرہنگ ابراہیمی اور شرف نامہ منیری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۸۶۲ھ/ ۱۴۵۷ء اور ۸۷۹ھ/ ۱۴۷۴ء کے درمیان ابوالمظفر باربک شاہ اول بنگالہ کے عہد میں تالیف ہوئی۔ اس لغت نامہ میں کلمات کے معنی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور معروف شعرا کے کافی شعری شواہد کا ذکر ہوا ہے اس لغت نامہ میں بہت سے باب ہیں اور ہر باب کے ذیل میں فصلیں شامل ہیں اور ان میں حروف اول و آخر کے اعتبار سے کلمات کو ترتیب دیا ہے۔ ترکی الفاظ کے معنی بھی ہر فصل کے آخر میں بیان ہوئے ہیں بقیہ ص ۱۷۹

قاضی خاں(۱) بدر محمد دہلوی دھاروال صاحب اداۃ الفضلا(۲)، شیخ لاد(۳) دہلوی صاحب، موید الفضلا اللہ داد فیضی سرہندی(۴) مولف مدار الافاضل، مجمع الفرس سروری وغیرہ

(بقیہ صفحہ ۱۷۸ اپر) یہ کشف اللغات و اصطلاحات کے مولف ہیں جو کہ دسویں صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی۔ یہ کتاب دو بار شایع ہو چکی ہے آخری بار نولکشور سے طبع ہوئی۔

۷۔ ان کا نام قاضی خاں بدر محمد دہلوی ہے ان کو فارسی لغات سے بہت دلچسپی تھی یہ ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء میں خان اعظم خان معظم سند عالی قدر خان ابن دلاور خان کی آستان بوسی کے ارادے سے جون پور سے مالوہ کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر جو کچھ ممدوح کے لیے سنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انہوں نے اپنی فرہنگ اداۃ الفضلا کے توسط سے خان اعظم قدر خان کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ان کا تعلق اس دور کے اہم مراکز سے رہا۔ پہلا مرکز دہلی دوسرا جونپور جو کہ عرصہ تک مشرقی ہندستان کا اہم علمی و ادبی مرکز تھا اور تیسرا دھاروال جس سے قاضی خاں متعلق تھے۔ ان کی ایک اور فرہنگ دستور الاخوان ۸۲۷ھ / ۱۴۲۳ء سے پہلے مرتب ہوئی تھی۔

(۲) اداۃ الفضلا فارسی کی قدیم فرہنگ ہے۔ اس کی ترتیب پہلے اور آخری حرف کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس کی ترتیب کے سلسلے میں مولف لکھتے ہیں کہ اس نے فارسی۔ دری۔ پہلوی اور ماوراالنہری کا لغات بحر فارسی فرہنگنامہ فخر قواس، رسالۃ التقصیر، رسالہ اسدی طوسی، دستور الافاضل، لسان الشعرا، فوائد برہانی وسرودسی (بحذف تکرار) سے الفاظ جمع کر لیے (ان فرہنگوں میں سوائے فرہنگنامہ رسالہ اسدی طوسی، دستور الافاضل حاجب خیرات اور فخر قواس کے بقیہ سب ناپید ہو چکی ہیں) اور دوسرے الفاظ اور بادشاہوں اور شہروں کے نام وغیرہ (باقی صفحہ ۱۸۰ اپر)

تیرہویں اصل:

اس اصل میں مولف نے لغت کے معنی ثابت کرنے کے بارے میں

جو متذکرہ فرہنگوں میں نہیں ملتے انھیں بھی زیرترتیب کتاب میں شامل کرلیا۔

علاوہ بریں خاقانی انوری، ظہیرفاریابی، فردوسی، نظامی سعدی اور دوسرے مشاہیرشعرا کی اصطلاحات و ترکیب کو خود مولف نے اپنی استعداد کے مطابق جمع کرلیا۔ یہ فرہنگ ہندستان میں لکھی گئی اور قدیم فرہنگوں میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ ادات الفضلا میں جو ہندستانی یا اردو کے الفاظ آگئے ہیں وہ مولف کے زمانے میں بول چال میں رائج تھے ان میں سے بعض الفاظ آج بھی مستعمل ہیں، بعض میں قدرے صوتی اور املائی تبدیلی واقع ہوئی ہے کچھ متروک ہوچکے ان الفاظ کا مطالعہ ہندستانی لسانیات کے ارتقا کو سمجھنے میں مفید ہوسکتا ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس فرہنگ میں شامل تمام ہندستانی الفاظ کا انتخاب کرلیا ہے ان الفاظ میں بعض ایسے ہیں جن کی صحیح صورت متعین نہیں ہوسکی ہے لیکن بعض اپنی ابتدائی شکل میں آج بھی مستعمل ہیں۔ یہ الفاظ عام بول چال کے ہیں ادبی نہیں ہیں، ان پر ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ کی طویل مدت گزرچکی ہے، اس لیے لسانی اہمیت سے قطع نظر یہ ہمارے لیے قیمتی سرمایہ کا کام دے سکتے ہیں لیکن ان الفاظ کی شکل اور معنی کا تعین اصل فارسی لغات کے بغیر دشوار تھا اس لیے فارسی لغات حروف تہجی کی ترتیب سے پوری تشریح کے ساتھ درج کیے گئے ہیں مثال کے لیے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

آفتاب پرستا۔ جانور الیستا کہ عرب آنرا وبا واہل ہند گھرگھٹ خوانند

ذکر کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کسی زبان کے الفاظ اور اس کے معنی کو ایک نسل سے دوسری نسل تک زبانی اعتبار سے فقط سنکر منتقل کیا جا سکتا ہے اور یہ منتقلی سلسلہ دار بھی ہو سکتی ہے اور غیر سلسلہ دار بھی (امام فخرالدین رازی نے اپنی کتاب محصول میں بتایا ہے کہ دونوں طرح کے طریقوں میں الفاظ کے معنی کے تعین میں بہت

صفحہ ۱۷۹ کے متن کا حاشیہ:

۳۔ تشریح: گذشت یارہ عرب نزاکو نول وا ہی ہند سا گو بینہ ادرن ۔ علاء لسیت کہ اہل ہند بتزا میسر گویند یہ تبادل الفاظ زفان گویا بحر الفضائل اور شرف نامہ وغیرہ میں موجود ہیں ۔

۴۰۔ یہ بہت نفیس لغت ہے۔ اس کے مولف شیخ محمد بن شیخ لاد دہلوی ہیں اور بقول بلوخمان "کنرط بیوشن ص ۹" یہ ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں شاہنامہ کے لفظوں اور اسکی عبارتوں، خمسۂ نظامی اور اشعار سنائی کے قطعہ، دیوان خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، معہری، حافظ، سلمان ساوجی اور سعدی وغیرہ کے الفاظ کی بھی تشریح کی گئی ہے ہولف مؤید الفضلا چند کتابوں کے مالک ہیں۔ مؤید الفضلا دو جلدوں میں پروفیسر محمد باقر کے اعتبار سے لاہور سے شایع ہو چکی ہے۔

۴۱۔ شیخ اللہ داد سرہند کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ بہت سے مستشرقین ان کا نام الٰہ داد لکھتے ہیں لیکن انہوں نے خود اپنا نام اللہ داد لکھا ہے

۵۱۔ شیخ فیضی نے اس لغت کو سلطان جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء میں مکمل کیا اور مادۂ تاریخ کو اس قطعہ سے نکالا ہے:

چوں این نامہ را نامۂ تیز رو | بپایان رساند از سر اختتام
پی سال تاریخ او از قضا | خرد گفت فیضی بگو "فیض عام"
| ۱۰۰۱ھ

زیادہ مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسئلوں کو آرزو نے حل کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آرزو نے کہا ہے کہ کیا عربی اور کیا فارسی دونوں میں یہ مسئلہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ فارسی کا حال عربی سے بھی گیا گذرا ہے کیونکہ عربی میں صحاح اور قاموس جیسی لغتیں موجود ہیں جو جامع ترین لغتیں تھیں اور ان کے ذریعہ ان مسئلوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے لیکن جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس دور کی جامع ترین لغت فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ سروری ہے اور ان میں غلط معنی اور تصحیف و تحریف فرہنگ رشیدی سے عیاں ہے جیسا کہ برہان قاطع میں درج ہے کہ اس کا ماخذ ایک سامانی کتاب[1] ہے جس کو ہندستان کے کسی عالم نے لکھا ہے جس کا وطن سامانہ ہے جو ہندستان کا مضافات سرہند میں ایک قصبہ ہے۔ ایسی صورت میں ان کتابوں پر یقین کرنا زرا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ صحت و اعتبار سے جو لفظ ملتے جلتے ہیں اور ان لفظوں کا عام لوگوں میں رواج ہے ان کو متواتر کہتے ہیں جیسے کہ برد، خفت رفت وغیرہ، اور دوسری صورت میں وہ الفاظ جن کا عام رواج لوگوں میں نہ ہو اور وہ غیر مشہور ہوں ان کو احاد کہا جاتا ہے مثلاً من ترا آزاد کردم عبد حرم بود) یا اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ میں نے تجھ سے قطع تعلق کر لیا، یا میں تجھ سے دور ہوا یا اپنا سامان پکڑ اور میرے گھر سے نکل تو اس طرح کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے۔ اگرچہ فقہا نے اس کی تصریح نہیں کی ہے۔

۱۔ رشیدی ص ۸۷، ۸۹، ۳۳۲

چودھویں اصل :

یہ اصل ان لغات سے متعلق ہے جن کے فارسی الفاظ کو بھلا دیا گیا ہے لیکن ان کی عربی مشہور ہے اور عام استعمال میں وہ رائج ہیں امام ثعالبی[1] اپنی کتاب فقہ اللغۃ میں بیان کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی فارسی کو تو بھلا دیا گیا ہے لیکن ان کی عربی مشہور اور محکم ہے جیسے کف، ساق، فراش، بزاز، وزن، کیال، مساح بیاع، دلال، صراف، بقال، حمال، قصاب، بیطار، رائض طرار خراط، خیاط، قزاز، امیر، خلیفہ، وزیر، حاجب، قاضی، صاحب البرید صاحب الخبر، وکیل، سفاء، ساقی، شراب، دخل، خروج، حلال حرام، برکت، علت، صواب، خطا، وسوسہ، حد، کساد، عاریۃ نصیحت، صورت، طبیعت، غالیہ، خلوق، حنا، جبہ، مقنعہ، دراعت ازار، مضربہ، لحاف، مخدت، نعل، فاختہ، قمری، خط، قلم، مداد، حبر وغیرہ۔ مولف مثمر کا کہنا ہے کہ جو کچھ ثعالبی نے بیان کیا ہے حقیقت میں ویسا ہی نہیں ہے کیونکہ صحاح کے ترجمہ صراح[2] میں کف کے معنی پنجہ آیا ہے۔ رائض فارسی میں شہسوار اور سواروں کو کہتے ہیں۔ فارسی میں خیاط درزی ہے اگرچہ درز کے معنی شگاف (سوراخ) کے ہیں۔ یہی معنی لغت قاموس میں بھی آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ معرب ہے۔ اسی طرح خراط، دال کے ساتھ فارسی میں خراد ہو جاتا ہے چنانچہ نورالدین ظہوری نے اپنے رسالہ خوان[3] خلیل میں اس لفظ

۱۔ رک مزھر ص ۶۱-۶۲، س ۱۳ سے آگے۔

۲۔ رک صراح میں ص-۳۶۲

۳۔ سہ نثر ظہوری کا رسالہ سوم جو کہ خوان خلیل کا دیباچہ ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۰۵، مصرعہ بالکل برعکس آیا ہے۔

کا استعمال کیا ہے

رندہ کرد است کجروی ز نہاد　　　　فرز را ز استقامتش خسراد[1]

خلیفہ جانشین کے معنی میں ہے اور عربی میں اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔
طراز فارسی میں کیسہ بُر کو کہتے ہیں اور فارسی میں تراز کے معنی علم جامہ ہے اور "ط" کے بجائے "ت" سے تراز ہے۔ قزاز ابریشم فروش کو کہتے ہیں۔ حاجب کو دربان، شراب بادہ و می سے ہے۔ دخل درآمد، حسد رشک وسوسہ، خار خار کساد ناروائی نصیحت اندرز، صورت چہرہ مقنعہ سر انداز، آزار خود لفظ فارسی ہے اور ایزار میں ی بڑھا کر بھی فارسی میں مستعمل ہے مفرب فارسی میں شادگونہ[2] ہے اور توشک سے مراد ہے جس پر سوتے ہیں۔ لحاف کو کنز اللغۃ میں لبقر اکند و پنبہ آگند ترجمہ کیا ہے۔ نعل سے مراد نعل اسپ، فارسی میں جوتے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ حبر کو سیاہی کہتے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

درنامۂ زمانہ بجز حرف جنگ نیست　　　　گویا کہ از سیاہی لشکر نوشتہ اند

پندرھویں اصل:

اس اصل میں مولف نے بتایا ہے کہ مفردہ[3] ہے جس کو ایک اہل لغت استعمال کرے لیکن دوسرا اس کو نقل نہ کرے۔ اور اگر دوسرا اس کو استعمال کرتا ہے وہ منفرد ہوتا ہے اس طرح کی مثالیں فارسی میں بہت پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ سراج اللغۃ کے مطالعہ کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) اصل: درد (۲) جہانگیری ص ۵، ۳۰۔ شادگونہ توشک باشد کہ بر آن خواب کنند۔ و آنرا نہالی نیز گویند۔ (۳) مزہر ص ۶۲: "وهي ما انفرد بروايته واحد من اهل اللغة ولم ينقله احد غيره وحكمها القبول ان كان المتفرد به من اهل الضبط والاتقان"

سولھویں اصل

یہ اصل فصاحت کلام سے متعلق ہے اور مزہر کے ان مباحثوں پر جو فصاحتِ کلام سے متعلق ہیں مبنی ہے۔ امام راغب کا قول ہے۔ "الفصح[1] خلوص الشیء مما یشوبہ واصلہ فی اللبن یقال فصح اللبن وافصح فھو فصیح ومفصح اذا تعری من الرغوۃ قال الشاعر و تحت الرغوۃ اللبن الفصیح ومنہ استعیر فصح الرجل جادت لغتہ وافصح تکلم بالعربیۃ وقیل بالعکس والاول اصح"۔ ابو بکر زبیدی نے[2] طبقات نحویان میں لکھا ہے کہ کلام ثعلب سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ میں فصاحت کا دارومدار الفاظ کے کثیر استعمال پر ہوتا ہے۔ زبیدی بھی اس رائے سے متفق ہیں کہ متاخر عربی کے ارباب بلاغت کی رائے کے مطابق ہر فرد کے لیے ممکن نہیں ہے کہ قدامت عہد کی بنا پر تمام زبانوں سے واقف ہو، مثلاً بہت سے الفاظ جو رودکی کے زمانے میں رائج تھے متوسطین و متاخرین کے شعرا یا مصنفین کے یہاں وہ لفظ نہیں پائے جاتے جس کی وجہ سے لغت کی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

خدایا راست گویم فتنہ از تست   ولی کس را نمی تابد تجیدن

لفظ تجیدن کے معنی اعتراض کرنا ہے۔ آرزو کے مطابق فصاحت کلام ان الفاظ اور محاورات پر منحصر ہے جو کہ غریب ہوتے ہیں اور قابل قبول

۱۔ مزہر ص ۹۱

۲۔ ایضاً ان مدار الفصاحۃ فی الکلمۃ علی کثرۃ الاستعمال العرب لھا فانہ قال اولی فصیحہ ھذا کتاب اختیار الفصیح من ما یجری فی کلام الناس وکتبھم فمنہ ما فیہ لغۃ واحدۃ والناس علی خلافھا فاخبرنا۔

دیر کشش بھی ہوں جبکہ تنافران الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کہ غلط اور بیکار لفظوں کی ترکیب سے بنتے ہیں۔ آرزو کے نزدیک کراہت سمع بعض کلمات کی ترکیب کے سبب ہوتا ہے جیسا کہ اس بیت میں ہے:

کو نگاہی کہ گلستان ترا سبز کند — دو جہان یک گل رعناست ز رعنائی تو

اسی طرح حرف "ب" راز لفظ کے ساتھ، چنانچہ ایک متاخر شاعر کا یہ شعر:

براز فقیران شب زنده دارت — بسوز و گداز دل عاشقانت

اسی طرح کوثر "ز" زای معجمہ کے ساتھ:

زانکه در نازک جهانی کوثر را سخن برده است

رُوس، جو کہ فعول کے وزن پر ہے روس فعل کے وزن پر استعمال کیا ہے، اسی طرح مسرو یطوس جو کہ مفعولات، کے وزن پر ہے مفاعیل کے وزن پر باندھا ہے، متاخرین میں سے کسی نے یہ ترجیع[1] بند کہا ہے:

تا نیک و بد زمانه خوبی — این به که بجا نمی شوی نیک
در کلبهٔ تنگ بی قراری — یک لحظه مرا نمی گذاری یک
بنشینم و سر نهم بزانو — در پردهٔ دل پرستم آن لد

الاک کو شیخ سعدی[2] نے خاک و پاک کے ساتھ قافیہ باندھا ہے اور ایسا سعدی نے شعری ضرورت کی وجہ سے کیا ہے اور اس صورت میں یہ جائز ہے:

چو در شعر گفتن ضرورت شود — تشدید چرا نه جائز بود

حزین کی اس[3] بیت کو

اگرچه عندلیب سالی ز نی خود بحکم پا براه شوق خسته فساده بیانیم — چو باز پرسی حدیث منزل ز شوق گویم لشت بوما

(۱) یہ ترجیع بند نجف آقای شانی کی ہے۔ (باقی صفحہ ۱۸۷ پر)

خان آرزو نے غلط جانا ہے اور اس کی پوری تشریح کی ہے
اگرچہ صد سال درزہ او زبی خودی ہا خدادہ با ہم
چو باز پرسی حدیث منزل ز شوق گویم نشست یوما
فارسی زبان دانوں کا یہ طریقہ ہے کہ عربی کی جمع کو مفرد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ بھی کثرت استعمال پر موقوف ہوتا ہے جیسا کہ اس بیت میں۔

دشمن آئینہ اندآنہا کہ عہد عزلت اند
خلوتی کا بنای جنسی کنند ائی کردہ پشت

لفظ ابنای جنسی بمعنی ہم جنس آیا ہے۔ اسی طرح لفظ اجلۃ الحکما ظہوری[1] کی اس بیت میں:

خمش چون شوم از غیب می دہند[2] ندا
کہ لب مبند ز مدح اجلۃ الحکما

بقیہ حاشیہ: ۱۸۶

۲۔ دیوان سعدی چاپ نول کشور، کانپور ۱۹۰۶ء ص ۶۶: سعدی کی ایک ایک معروف ترجیع بند اس طرح ہے:

ای برتو قبای حسن چالاک — صد پیرہن از جدائیت پاک

اور دو بیت جن میں خاک و پاک کا قافیہ استعمال ہوا ہے اس طرح ہے:

پشت بہ تواضع است گوئی — افتادن آفتاب بر خاک

ما خاک شویم و ہم نگردد — خاک درت از جبین ناپاک

اور قافیہ الاک اس بیت میں ہے: جای طلب از روشن فرو ماند
می بینم و چارہ نیست الاک

(۳) رک سفینہ خوشگو، ص ۴۰

---

(۱) یہ مقالہ انگریزی میں ہے ص ۱۸۶ یہ قصیدہ حکیم محمد یوسف بیجاپور کی مدح میں ہے۔
(۲) اتصل بکنند۔

یہاں بجائے اجلّ' اجلۃ الکلما استعمال ہوا ہے اور ان دونوں لفظوں کے غلط ہونے کی وجہ ایک ہی ہے یعنی تلفظ اور عدم فصاحت۔ اساتذہ میں سے کسی نے بھی اس کو نہیں استعمال کیا ہے۔

مولف کے نزدیک لفظ کے فصیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایکسا تھ ہم معنی لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیئے جیسے ارزقی :

توآں کسی کہ زبہر گزافہ بخشیدن زز زر وسیم ہمی کم کنی رسوم حساب[2]

سترھویں اصل :

یہ اصل ردّی اور مذموم الفاظ سے متعلق ہے۔ ابن فارس فقۃ[3] اللغۃ میں فرماتے ہیں :

"منہا اللخلخانیۃ والکشکشۃ والکسکسۃ" یہ تحقیق مزھر سے ماخوذ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عرب قبیلوں میں عربی الفاظ کے لہجے الگ الگ ہیں مثلاً قیس اور تمیم قبیلہ لفظ کے ابتدا کے ہمزہ کو عین میں تبدیل کردیتا ہے اور الم (رنج) کو علم (جھنڈا) پڑھتا ہے۔ انک کو عنک اذن کو عذن میں بدل دیتا ہے۔ تمیم قبیلہ کاف مونث کے بعد شین کا استعمال کرتا ہے اور اس کو مکسور کردانتا ہے اور بک کو بکش اور علیک کو علیکش پڑھتا ہے ربعہ اور مضر بجائے کاف کے شین لے آتے ہیں جیسے منک کو منش اور علیکسا کو علیشں پڑھتے ہیں۔ لغت میں میں جیم اور کاف کے درمیان جو حرف ہوتا ہے اس کو یمن بدل

۱۔ دیوان ارزقی چاپ نفیسی ص ۴

۲۔ دیوان : زرسیم خلق

۳۔ مزھر ص ۱۰۹

دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمیم قبیلے کے لوگ کاف کو گاف کہتے ہیں۔ خان آرزو بتاتے ہیں کہ تمیم قبیلے کے لوگ قال کو گال بولتے ہیں۔ انہوں نے ایک مشہور قصہ نقل کیا ہے کہ ہندستان کے بادشاہوں میں سے کسی نے ازراہ شوخی ایک ایرانی سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے یہاں غین کو قاف میں بدل دیتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ حضرت آپ سے کسی نے غلط کہا ہوگا۔ بادشاہ اس کی یہ بات سنکر مسکرا دیا۔ اسی طرح حرف نون جو الف کے بعد آتا ہے واؤ میں تبدیل کر دیتے ہیں چاہے وہ لفظ عربی کا ہو یا فارسی کا مثلاً دکان کو دکون اور جان کو جون کہتے ہیں لیکن یہ تبدیلی صرف بول چال کی زبان میں ہوتی ہے۔ لکھنے پڑھنے میں اس کو اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ شعرای متاخرین میں سے کسی نے شعر میں لطف پیدا کرنے کے لیے اسی طرح اپنے شعر میں استعمال کیا ہے، اور اگر اس طرح نہ کریں تو وہ شعر غلط ہو جاتا ہے اور اگر اسی طرح ہی لکھیں تو شعر اپنے پایہ سے گر جاتا ہے، جیسا کہ مخلص کاشی اس شعر میں بیان کرتے ہیں:

کار معجون کمونی می کند پیکان او

یہاں کمان کو کمون کر دیا ہے۔ اور معجون کمونی استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ایک اہل زبان سے سنا ہے کہ وہ میم جو الف کے بعد ہوتا ہے اس کو بھی واو میں تبدیل کر دیتے ہیں اور شہزادہ کام بخش کو کوم بخش کہتے ہیں۔

اٹھارھویں اصل

اس اصل میں مولف نے مطرد (عام الفاظ) اور شاذ (جو الفاظ کبھی کبھی استعمال کیے جاتے ہیں) کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ سے ابن جنی[1] نے لغت کی خصوصیت کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس کو

۱- مزھر ج ۱ ص ۱۱۲ بعید: "قال ثم اعلم أن الکلام فی الاطراد والشذوذ علی اربعة اضرب مطرد فی القیاس والاستعمال جمیعاً وھذا الکلام ھو الغایة المطلوبة نحو زید وضربت عمراً ومررت بسعید، ومطرد فی القیاس شاذ فی الاستعمال وذلک نحو الماضی من یذر ویدع کذلک قولھم مکان مبقل ھذا ھو القیاس والاکثر فی السماع باقل والاول مسموع ایضاً حکاء ابو زید فی کتاب حیلة ومحالة وانشد اعاشنی بعدک واد مبقل

ومما یقوی فی القیاس ویضعف فی الاستعمال استعمال مفعول عسی اسمی صریحاً نحو قولک عسی زید قائماً او قیاماً ھذا ھو القیاس غیر ان السماع ورد بحظرہ والاقتصار علی ترک استعمال الاسم ھاھنا وذلک قولھم عسی زید ان یقوم وقد جاء عنھم شیء من الاول انشدنا ابو علی

اکثرت فی العذل ملحاً دائماً لا تکثرن انی عسیت صائماً

ومن المثل السائر عسی الغویر ابؤسا (والثالث) المطرد فی الاستعمال الشاذ فی القیاس نحو قولھم اخوص الرمث واستصوبت الامر اخبرنا ابوبکر احمد بن یحیی قال یقال استصوبت الشیء ولا یقال استصبت ومنه استحوذ واغیلت المراہ واستنوق الجمل واستتیست الشاة واستفیل الجمل (والرابع) الشاذ فی القیاس والاستعمال جمیعاً وھو کتتمیم مفعول مما عینه واو نحو ثوب مصوون ومسک مدووف وحکی البغدادیون فرس مقوود ورجل معوود من مرضه کل ذلک شاذ فی القیاس والاستعمال فلا یسوغ القیاس علیه ولا رد غیرہ الیه

بیان کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ کلام میں صناعت کی جگہ اعراب وغیرہ کا مسلسل استعمال ہو تو اس کو مطرد کہتے ہیں اور اگر معاملہ اس کے برخلاف ہو تو اس کو شاذ کہتے ہیں۔ آرزو کا کہنا ہے کہ مطرد و شاذ کے اصول فارسی اور عربی میں تقریباً یکساں ہی ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں حزین کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ جس میں لفظ پالایم کے بجائے پالم کا استعمال کیا گیا ہے اور یہ شاذ کی ایک بہترین مثال ہے[1]

حزین از دیدہ می پالم نگاہ حسرت آلودی۔ کہ از آغوش مژگان دادہ ام خاک صفاہان را

پالم پالودن سے ماخوذ ہے اور اس کا فعل مستقبل پالایم ہے نہ کہ پالم۔ اسی طرح ہر مصدر جس کے آخر میں دال اور نون یا تا و دال و دال و نون ہوتا ہے صیغہ مستقبل میں واو الف اور ی میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً فرمودن فرماید، آسودن آساید، نمودن نماید، کشودن کشاید زدودن زداید، ستودن ستاید۔ یا مصدر کے حرف نون کے بعد واو کو مفتوح کر دیتے ہیں جیسے ستودن ستود، درودن درود، غنودن غنود، اور بعض جگہ دونوں طرح سے ہوتا ہے جیسے بودن بود اور باید۔ حقیقت یہ ہے کہ شاذ اس وقت ہو جاتا ہے جبکہ اس کا استعمال بہت کم ہو۔ اسی طرح کا جھگڑا لفظ چون اور چنان کے سلسلے میں ہے کہ چون مفرد ہے اور چنان مرکب، مثلاً کہیں گے "چشمش چون نرگس است" اور دوسری جگہ "چشمش چنان است کہ نرگس" اور یہ مطرد کے قاعدہ کے مطابق ہوا اگر اس کے برخلاف ہو گا تو شاذ کہلائے گا اور غیر فصیح بھی۔ چنانچہ صائب کی اس بیت پر اہل روزمرہ نے اعتراض کیا ہے[2]

---

(۱) دیوان حزین ص ۲۱۲ (۲) ایضاً سفینہ حزین ص ۸۰: نالم

چون لباس غنچہ تنگی می کند بر دوش گل　　　　بر فرازد این عمارت پر نیان آسمان

انیسویں اصل:

یہ اصل اٹھارھویں اصل کا تسلسل ہے اور وحشی (فصیح) اور غریب (غیر مشہور یا غیر فصیح) الفاظ سے متعلق ہے۔ علمای عربی[1] کا کہنا ہے کہ وہ الفاظ جن کو صرف عالم کامل ہی سمجھ سکیں وہ فصیح ہوتے ہیں لیکن یہ فصاحت کلام کو متاثر کرتے ہیں کیونکہ ان کو عام آدمی نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ایک عباسی خلیفہ نے اپنے منشی سے کہا کہ اپنے کلام میں بلاغت اظہار کے لیے وحشی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرو کیونکہ یہ جہالت ہے اور ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرو جو کہ سہل اور آسان ہوں اور ان کے معانی آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ آرزو کا کہنا ہے کہ فارسی میں بھی اسی طرح سے ہے چنانچہ اہل فصاحت کہتے ہیں کہ لفظ ہمیشہ آشنا اور معنی بیگانہ ہونے چاہیے۔ اسی لیے فصحا اور بلغا لوطیانہ[2] زبان سے پرہیز کرتے تھے۔

۱۔ مزھر ج ۱ ص ۱۱۴ : (قال) واذا کانت اللفظة حسنة مستغربة لا یعلمها الا العالم المبرز والاعرابی القح فتلک وحشیة (قال) ابراھیم ابن المھدی لکاتبه عبداللہ بن صاعد ایاک وتتبع وحشی الکلام طمعا فی نیل البلاغة فان ذلک ھو العی الاکبر وعلیک بما سھل مع تجنبک الفاظ السفل"

(۲) بھانڈوں کی زبان

ہمیں معلوم ہے کہ فارسی دوسری زبانوں مخصوصاً عربی زبان سے مخلوط ہے. اس لیے ایسے عربی الفاظ غریب کہلائیں گے جن کے معانی معلوم کرنے کے لیے بسیط کتب کی ضرورت ہو مثلاً جوہری کی صحاح[1]، مجدالدین فیروزآبادی کی قاموس[2]، بیہقی کی تاج الاسامی[3] وغیرہ لیکن بعض شعرائے عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو واقعی حسنی (فصیح) ہیں. ملا طغرا مشہدی نے ہندی الفاظ کو اپنی نظم میں استعمال کیا ہے. ان کا ایک شعر یہ ہے.

نورخ سوسن را مکو دل می رباید تشقہ اش ذات رجیوت است ترسم دست بر جمدھر کند

۱- صحاح اللغۃ عربی کی قدیم ترین لغت ہے. اس کے مولف ابونصر اسماعیل بن حماد فارابی ہیں جن کا شمار اہم ادبا میں ہوتا ہے مقدمہ لغت نامہ دھخدا ص ۲۰۶ ببعد

۲. نام فیروزآبادی محمد، کنیت ابوطاہر اور لقب مجدالدین تھا. وہ فارس کے ایک قصبہ فیروزآباد میں ۷۲۹ھ / ۱۳۲۸ع میں پیدا ہوئے اور ۸۱۷ھ / ۱۴۱۳ع میں یمن میں فوت ہو گئے. ان کی تالیفات میں "کتاب القاموس المحیط و القابوس الوسیط" سب سے مشہور کتاب ہے جو کہ عربی زبان میں ہے، لغت نامہ دھخدا ص ۲۲۵، ببعد۔

۳. اگر مولف سے مراد بوجعفر بیہقی ہے تو ان کی لغت کا نام تاج المصادر ہے نہ کہ تاج الاسامی: مقدمۂ لغت نامہ دھخدا ص ۲۷۹. ببعد. بیہقی رمضان ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ع میں فوت ہوئے لیکن ابوالفضل بیہقی نے بھی لغت لکھی ہے اور یہ لغت "مجموعہ لغز" میں شامل ہے چاپ علی اصغر حکمت، مقدمۂ لغت نامہ دھخدا ص ۲۶۶، ببعد.

آرزو کے قول کے مطابق تاریخ وصاف[۱] میں بہت سے وحشی اور غریب الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو کہ عربی اور ترکی سے فارسی میں لیے گئے ہیں

بیسویں اصل

یہ اصل بہت طویل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لفظ اگرچہ فصاحت کے اعتبار سے ملتے جلتے ہیں لیکن اعراب (حرکت) کی وجہ سے ان کے معنی میں بہت فرق ہوجاتا ہے۔ اس مسئلہ پر اس اصل میں طویل بحث کی گئی ہے اور اس طرح کے الفاظ کی ایک طویل فہرست بھی دی گئی ہے جو ساخت کے لحاظ سے ملتے جلتے ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ کچھ الفاظ بطور نمونہ ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

حرکت (اعراب) کے اعتبار سے فرق

جراک	زبر اور زبر
افتاد	پیش اور زبر
نشتر	زیر اور زبر
بستر	زیر اور زبر
سخن	زیر اور پیش (خ پر)
پیرامن	پیش اور زبر (م پر)
پیل سم	زبر اور پیش
کافر	زبر اور زیر

لفظ کافر سیفی بدیعی کے مندرجہ ذیل شعر میں زیر کے ساتھ استعمال

۱۔ تالیف شرف الدین عبداللہ کاتب شیرازی م: ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء ہے اور وصاف الحضرۃ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ تاریخ جس کا اصلی نام تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار ہے تاریخ وصاف کے نام سے مشہور ہوئی۔

ہوا ہے اور اہل ہند لُسے لعنت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں :

در شہر ز ترکانِ جفا کیش ستم گر   بیرحم تری نیست از ین قاسم کافر

لفظ بہنْ[1] میں "ہ" ساکن ہے لیکن امیر خسرو حرکت کے ساتھ لائے ہیں۔

چون گُل سوری شدہ گرد د بہن   لعل ترا ز لالہ بروی چمن

لفظ گیومرث[2] قدما کے یہاں سکون "ر" سے استعمال ہوا ہے جبکہ متاخرین ایرانی مصنفین کے یہاں حرکت سے آیا ہے ۔

۱- جہانگیری ج ۲ ص ۲۱۶۱ بہن با ول وثانی مفتوح شیری باشد کہ بہ سبب مہربانی وشفقت مفرط در پستان مادر طغیان کند مولانا آنی گفتہ۔

پستان مثال غنچہ از شیر شبنم است   از مہر طفل سبزہ برون آمدش بہن

۲- چراغ ہدایت ص ۹۸ : نام اول بادشاہان عجم مخفی نماند کہ این لفظ در عرف متاخرین بکاف تازی وثای مثلثہ شہرت دارد وحال آنکہ ثای مثلثہ در فارسی اصل نیست چنانکہ ارباب تحقیق گفتہ ونفس الامر آنست کہ بفتح کاف فارسی وتحتانی بواو رسیدہ ومیم مفتوح ورای مہملہ وساکن وفوقانی موقوف، فردوسی فرماید۔

نخستین خدیوی کہ کشور کشود   سر پادشاہان گیومرث بود

وتفصیل آن در لغات قدیمہ نوشتہ شد وحق نزد فقیر آرزو آنست کہ گیو تلب گوی بمعنی گویندہ ومرت مبدل مرد بمعنی مرد گویا ظاہرا بادشاہ مذکور خوش زبان وشیرین محاورہ بود کہ بدین نام موسوم وملقب گشت وعجب آنکہ محسن تاثیر گوید کہ از شعرای قرار دادۂ ایران است۔ این لفظ را بحرکت رای مہملہ آوردہ وابن سہو است باآنکہ این قسم ہم بنظر درآمدہ باشد از عالم ترس کہ بسکون را وحرکت آن ہر دو آمدہ لیکن در کتب لغت کہ مشہوراند چنین دیدہ نشد ومی تواند کہ از عالم تصرف شاعر قادر سخن بود کہ اسکان وتحریک وتخفیف وتشدید مراد را جائز است از راہ قدرت وتصرف نہ از روی عجز چنانکہ در جاہا نوشتہ ام ، محسن تاثیر گوید :

در بندگی تو از سلاطین   زد سکہ گیو مرث نخستین

دونوں طرح کی مثالیں چراغ ہدایت میں درج ہیں مولف کے نزدیک قول اول صحیح ہے۔ کیونکہ یہ مرکب ہے "گیو"[1] کاف فارسی سے بمعنی گوی و مرت مبدل بہ مرد بمعنی مرد گو یا کہتے ہیں اور گیومرث بثا مثلثہ اس کا معرب ہے۔ جو کچھ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ فارسی الفاظ کے لیے مخصوص تھا یہی طریقہ کاران عربی الفاظ کے ساتھ بھی اختیار کیا گیا ہے جو فارسی میں مستعمل ہیں۔ یہاں کچھ الفاظ دیے جاتے ہیں جو لہجہ کے اعتبار سے فرق رکھتے ہیں۔ نصر بفتح بمعنی یاری کردن، معزی[2]

تاکہ بگیتی مدد است از طرب   تا کہ بعالم نصر است از ظفر
از طرب آباد مدد بر مدد   وز ظفر آباد نصر بر نصر

اسی طرح لفظ عفو، سعدی کے درج ذیل شعر میں[3]

عفو[4] کردم از وی عمل ہای زشت   در آرم بفضل خودش در بہشت

ناصر خسرو نے روشنائی نامہ کے خاتمہ پر یہ شعر درج کیے ہیں[5]

سپاس و شکر آن داد از[6] ذوالمنن   کہ این نو باوہ[7] پیدا کرد[8] از من
اگر سہوی بود در وی عفو کن   در یدہ پردہ کارم را رفو کن

۱۔ اس کلمے کے سلسلے میں آرزو کو غلط فہمی ہوئی ہے، گیومرت مرکب ہے گیو یعنی زندگی، و مرتن یعنی مردن و درگذشتنی مردم - رک برہان قاطع ج ۳ ص ۱۸۷۲ اور بہار تولمہ سے منقول ص ۵۰۳ کا حاشیہ

(۲) پہلی بیت دیوان معزی میں میری نظر سے نہیں گذری لیکن دوسری بیت کے لیے ملاحظہ ہو۔ دیوان ص ۳۱۸۔ (۳) کلیات سعدی ص ۳۱۲-(۴) ایضاً: از دو عفو کردم

(۵) دیوان ناصر خسرو ص ۵۴۲، چاپ تہران (۶) ایضاً: از داری۔

(۷) ایضاً: بکرہ تازہ (۸) ایضاً: کرد ی۔

کفو، بہار الدین کرمی کی اس بیت میں :

طرہ دیدن امثال تو چون شانہ کنی   جز درآئینہ نہ بینی بہمہ حال کفو

لیکن کفو حرکت کے ساتھ آرزو کے نزدیک غلط ہے جیساکہ سراج میں کفو ک پر پیش اور ف سکون کے ساتھ مانند اور ہمتا کے معنی میں میں آیا ہے، اسی طرح لفظ کفن تحریک کے ساتھ جس کے معنی میت کے لباس کے ہیں۔ یہ لفظ فارسی میں سکون کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ شفائی ہجو میں ایک شعر کہتا ہے :

ذوقی پس مرگ تر شاست شنوید   از لتہ حیض خواہرت کفن کنند
بینی تر انجودی کہ گیسر د گور   در دخمہ منیت مکر دفن کنند

اسی طرح بوقلمون میں قاف اور لام پر زبر ہے اور لام پر سکون کے ساتھ بھی آیا ہے مثلاً ناصر خسرو کے اس شعر میں[1] :-

از گلاب و مشک بہر ش سازی آب و خاک و خشت
ہم ز عود و صندل آنرا روی بو قلمون کنی

منوچہری[2]

فروزاں[3] تیغ وی ہنگام ہیجا   چنان دیبای بوقلمون ملون

لفظ تنواری میں ت سکون کے ساتھ ہے جیساکہ سلمان کے اس شعر میں[4] :

---

(۱) دیوان ناصر خسرو ص ۴۰۵، شعر اس طرح ہے :-
از گلاب و مشک سازی خشت او را خاک و آب   در ز عود و فرش او روی بوقلمون کنی

(۲) دیوان منوچہری، چاپ سباقی، ص ۶۵ (۳) متن فروی آن

(۴) سلمان کے دیوان میں یہ شعر میری نظر سے نہیں گذرا لیکن لفظ تنواری کے لیے ملاحظہ ہو لغت فرس ص ۱۲۰ اور وہاں یہ شعر شاہد کے طور پر آیا ہے :
دوش تنواریک بوقت سحر   اندر آمد ز خیمہ آن دلبر

گاہ آنست کہ بر ہجر نہم دل کو کو   دیرہا ہست کہ از نیز جو من متوار کا است

اسی طرح ارنی میں "ر" سکون کے ساتھ۔ صلواۃ میں لام پر زبر ہے اور کہیں ساکن بھی ہے عرق میں "ع" اور "ر" پر زبر ہے سبلت میں "ب" ساکن ہے قرن میں "ر" ساکن ہے، لیکن انوری کے شعر میں حرکت کے ساتھ استعمال ہوا ہے[1]

وی[2] دو قرن از کرمت بردہ جہان مرگ نواست
تو چہ دانی کہ جہان بی تو چہ بی برگ و نواست

کبھی اہل فارسی لفظ کی ماہیت میں تبدیلی کر دیتے ہیں جیسے لفظ نکہت میں "ن" پر زبر ہے، اس کو پیش کر دیتے ہیں اور کاف کی جگہ گاف کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے معنی میں بھی تبدیلی کر دیتے ہیں جیسے قلیان جو کہ عربی میں غلیان ہے۔

اکیسویں اصل:

اس اصل میں آرزو نے بتایا ہے جب لفظ بنائے جاتے ہیں اس وقت ان کے تلفظ میں بعد کے مقابلے میں نمایاں فرق ہوتا ہے اس طرح کے فرق دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ دو حروف کو ایک حرف میں بدل دینا۔ یہ طریقہ فارسی میں بہت رائج ہے جیسے نیم من۔ اس صورت میں پہلے میم کو دوسرے میم میں مدغم کر دیا اور پھر تخفیف کے لیے ایک کو حذف کر دیا اور نیمن بنا دیا۔

۱۔ دیوان انوری ص ۷۴

۲۔ متن: وی نہیں ہے۔

۲۔ ایک حرف کو ایک ساتھ ہی دو بار استعمال کرنا جیسے شپرہ کے بجائے شپ پرہ۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس میں حروف کو مرتب کرنے میں تشدید کے استعمال سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن عربی میں تشدید کا استعمال ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ عربی الفاظ جو فارسی میں استعمال ہوئے ہیں ان میں بھی تشدید سے کام لیا جاتا ہے جیسے ۔

مما	من ما
ممن	من من
عما	عن ما وغیرہ

کمال اسماعیل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں[۱]

خہ خہ ای دلبر درّا دوزرا نیک[۲] می درّی و خوش می دوزی

درّا دوزرا کے معنی صاحب تجربہ ہیں ۔

خرّم تازہ اور شاد کے معنوں میں اور یہ بغیر تشدید کے بھی استعمال ہوا ہے ۔ میر معزی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں[۳]!

موسم عید و لب دجلہ و بغداد خرم۔ بوی ریحان و فروغ قدح و نالۂ بم

فرخی[۴]!

زخوی خوش تو ہر روز شادمانہ بود ہزار بار زیزدان محمد مختار

۱۔ دیوان کمال اسماعیل چاپ بحر العلوی ص ۷۲۵ ۔

۲۔ ایضاً : خوب ۔

۳۔ دیوان امیر معزی ص ۴۷۹ ۔

(۴) دیوان فرخی چاپ سپہر ص ۶۱، شعر اس طرح ہے :

زخوی خوش ہر روز شادمانہ شود ہزار بار روان محمد مختار

رودکی[1]

بیا کی گوئی اندر جام مانندِ گلابستی بخوشی گوئی اندر دیدۂ بی خواب آبستی

کجّی ضدِ راستی ہے، انوری[2]:

بیا تا کثر نشینم راست گویم کہ کجّی[3] ماتم آرد راستی سور

تشدید دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جس کا تخفیف (گرانا) کرنا بھی درست ہوتا ہے اور دوسرے وہ جس کا ختم کرنا ٹھیک نہیں ہوتا جیسے کلّہ بمعنی سر و صورت، پلّہ بمعنی کفۂ ترازو، تکّہ بمعنی نازک سلّہ[4] صنّجہ۔ لہاک[5] یمّر، ستّہ، جرّس، جلّہ وغیرہ۔ کافیہ کو ملاطفرا اس شعر میں تشدید کے ساتھ استعمال کرتے ہیں:

از و گشت کافیہ زیر و زبر نشد آگہ از مبتدا و خبر

۱۔ دیوان رودکی چاپ نفیسی ج ۳ ص ۱۱۲۸

۲۔ دیوان انوری ص ۲۳۰

۳۔ ایضاً، کثری

۴۔ رشیدی ص ۸۷۶: سلّہ بفتح و لام مشدد زنبیل و سبد و در متعارف سبد بزرگ ہیں را گویند کہ میوۂ بسیار خصوصاً انگور در آن کنند و بر سر نہند و آن جماعت را سلہ کشہا خوانند۔

۵۔ جہانگیری میں مجمل التواریخ والقصص کے بارے میں بتایا گیا ہے حاشیہ میں ص ۹۰ پر ملاحظہ ہو:
"لہاک باول مفتوح و تشدید یا نام برادر پیران ویسہ است کہ در جنگ دوازدہ رخ گریخت و گستہم او را تعاقب نمودہ کشت؛

اندر عہد افراسیاب: پہلوان او پیران ویسہ .... چون ھومان و لہاک و ورد

فردوسی: چو لہّاک روی برادر بدید بدانست کز کارزار آرمید

تشدید فارسی میں بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ضرورت کے لحاظ سے تشدید کو ختم کر دیتے ہیں۔ لفظ زقوم جس کے معنی مشہور درخت کے ہیں سعدی کے یہاں اس طرح استعمال ہوا ہے[1]،

درخت زقوم از بجان پروری مپندار ہرگز کزو برخوری

کیفیت، سحری شمشیر گر:

می کو ز دست ساقی مشکیں کلالہ نیست
در صد سبوش کیفیت یک پیالہ نیست

مشاطہ، نظیری[2]،

زمن مشاطہ بتان صداق می طلبد ہنوز دختر زر در سرا چہ عنبی است[3]

حق، حافظ:

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست
در حق ما ہر چہ گوید جای ہیچ اکراہ نیست

مستحق، کلیم:

عطاش مستحق و غیر مستحق نشناخت ۔ سر ریز دا برچہ ویران چہ منزل آباد

۱۔ بوستان باب اول چاپ جاویدان ص ۲۵
۲۔ دیوان نظیری۔ چاپ مصفا ص ۱۰۱
۳۔ ایضاً۔ حلبی
۴۔ دیوان حافظ چاپ قزوینی ص ۵۰
۵۔ یہ شعر دیوان ابوطالب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔

موذن، شیخ نظامی[1]:

برآورده موذن باول قنوت فسبحان[2] حی الذی لایموت،

سمنار جوکہ عربی لفظ ہے. نظامی:

چابکی چرب دست شیرین کار سام نسلی و نام آن سمنار

دراعہ کے معنی کپڑے کے آتے ہیں، سعدی[3]:

بآدمی نتوان گفت ماند این حیوان. بجز دراعه و دستار و نقش بیرونش

عیار حکیم سوزنی[5]

جہانداران ز چشم او شکوہند چو طراران شکوہند از عیاران

جمّازہ، نظامی[6]

جمازہ بہ تنگ آمد از راہ تنگ سر از بار سنگین درآمد بسنگ

نیت، نظامی[7]:

پناهنده را یاد کرد از نخست نیت کرد بر کارگاری درست

۱۔ شرف نامہ گنجوی نظامی چاپ ارمغان ۱۳۱۶ شمسی ص ۲۸

۲۔ ایضاً: کہ سبحان

۳۔ گلستان چاپ تہران ۱۳۴۸، ص ۹۱

۴۔ ایضاً: مگر

۵۔ دیوان سوزنی چاپ ناصرالدین شاہ حسینی ہیں اس سے صرف نظر کیا گیا ہے

۶۔ شرفنامہ گنجوی ۴۴۔ لیکن مصرع اول مصرع دوم ہے اور مصرع دوم اول ہے

۷۔ ایضاً: سراز (پای)، بارسنگین ... الخ

۸۔ یہ شعر شرفنامہ اور اقبالنامہ میں میری نظر سے نہیں گذرا اگرچہ یہ ردیف اور

عزّی در مکّہ، فرخی[1]

منات ولات و عزی در مکہ سہ بت بودند
زدست بردبت آرای آن زمان آزر

دو زآن پیمبر بشکست ہر دو را و امروز[2]
فتادہ اند ستان بیش کعبہ بی پا و سر[3]

منات را زمیان کافران بدر بردند[4]
بکشوری دگر اندا ختند زان کشور

بجایگاہی کزروزگار آدم باز
بر آن زمین نہ نشست و نرفت جز کافر

زبہر آن بت بتخانہ بنا کردند
بصد ہزار تماثیل و صد ہزار صور

پس آنکہ آنرا کردند سومنات لقب
لقب کہ دید کہ نام اندر او بود مضمر

یہ تمام الفاظ تشدید کے ساتھ ہیں جن کو شعرا نے اپنے کلام میں بغیر تشدید کے استعمال کیا ہے۔

بائیسویں اصل:

اس اصل میں خاص حالتوں میں حروف کے حذف کرنے کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ بقول آرزو ایک یا دو حرف کو حذف کرنے کے

۱۔ دیوان فرخی طبع مجلس تہران ص ۷۱۔
۲۔ ایضاً و ہر دو را امروز
۳۔ ایضاً: فگندہ بوستان بیش کعبہ پای بسر
۴۔ ایضاً: بدر دیدند

بعد کچھ الفاظ کے معیار میں کوئی فرق نہیں آتا یعنی حرف کے حذف کرنے سے پہلے جوان کی حیثیت تھی وہی برقرار رہتی ہے اوران کی مقبولیت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ مثلاً

چشم زخ	چش زخ
هنوز	نوز
اکنون	نون
گوزن	گوز
چون وچرا	چون وچــر
فرد۔دین	فردین وفوردین وفرودین۔

مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں، پوربہا:

بیدار شو رسید بشارت که یافته است (۱) — از چش زخ حوادث قطب زمان شفا (۲)

حکیم سنائی (۳):

مطلع بر ضمائر اسرار — نوز نا کرده بر دل تو گداز (۴)

عضائری رازی (۵):

بعالم اندر نون مالک ملوک توئی. جمال شاں ہمہ از تست گاہ جود و نوال

۱۔ یہ بیت جہانگری ص ۱۲۶۳، رشیدی ص ۱۰۵ میں کمال اسماعیل کے نام سے بطور شاہد چشم زخ آیا ہے جو کہ چشم زخم کا مخفف ہے (۲) ایضاً: جہان

(۳) آرزو نے اس بیت کو جہانگیری سے نقل کیا ہے جہانگیری میں اسی ذیل میں سوزنی کی ایک بیت بھی درج ہے (۴) متن: کنار

(۵) آرزو نے عضائری رازی کی یہ بیت جہانگیری بیت ص: ۱۲۸ سے نقل کیا ہے۔ اس میں فرخی کی بھی ایک بیت اسی ذیل میں درج ہے۔ (۶) جہانگیری: جلال۔

شاہ رخ ابن تیمور کے ایک امیر شہاب الدین عبدالرحمٰن نے شاہ ملک کے مرثیہ میں لکھا ہے:

نگر آید[۲] خبر تعزیت میر کبیر — آنکہ در جنگ بجنگش چو گوز بود پلنگ

سیفی بدیعی کا یہ شعر:

ہر گہ کہ چون آرا بہ شوم در رہش روان — غلطان شوم براہ و نہ چون گویم دنہ جہ

عبدالواسع جبلی[۳]:

تا باد بیران سرو بود درمہ آذر — تا برگ ازان زربود درمہ فرد[۴]ین

خور ز[۵] بایدباد گلرنگ[۶] و بوی گل کنی — چون چمن خالی شد از گلہای ماہ فرور[۷]دین

میر معزی[۸]:

ہمیشہ تا کہ جہاں را سپہر پیر کہن — جوان و تازہ بہنگام پرودین دارد

جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے وہ فارسی حروف میں حذف کرنے کے بارے میں تھا، یہی انداز دوسری زبانوں مثلاً یونانی وغیرہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے:

۱- یہ بیت جہانگیری ص ۲۰۸۲ سے نقل کی گئی ہے۔

۲- جہانگیری میں یہ دونوں مصرعے بالکل برعکس ہیں۔

۳- دیوان عبدالواسع جبلی ص ۳۲۹، جہانگیری ص ۱۰۶۷

۴- دیوان جبلی: تشرین

۵- ایضاً: ص ۳۲۰، جہانگیری ص ۲۰۴۹

۶- ایضاً، ہمرنگ

۷- ایضاً فرد دین (۸) دیوان معزی ص ۱۸۳، دوسرا شعر فرد دین کے ذیل میں ص ۱۷۱ پر اس طرح ہے! الا تا گونہ زیر پہنائی ازماہ دی دائماً چنان چون زبرنای زماہ فرددین دارد

سطاطالیس	ارسطاطالیس
صلاب	اصطرلاب
مسرودیطوس	مسرودیطوس

چند شعر ملاحظہ ہوں، حکیم سنائی[1]

شدہ در راہ حکمت و تدریس ۔۔۔ برتر از یونس و سطاطالیس

فردوسی[2]:

ہمہ زیج و صلاب بر داشتند ۔۔۔ بران کار یک ہفتہ بگذاشتند

خاقانی:

دُر[3] یخت بجلق علی الروس ۔۔۔ صد مسرو طوس و مسرودیطوس

عربی الفاظ میں بھی حذف سے کام لیا گیا ہے:

ضرورت	ضرورۃً (تنوین کے ساتھ
ضرور	ضرورت
کدور	کدورت
دی	دیجور، دیجوجی، دیجور۔
شقاق	شقایق
عجوبہ	اعجوبہ
سرار	اسرار

۱۔ حدیقۃ الحقیقۃ سنائی ص ۴۷۷۔

۲۔ شاہنامہ ج ۱ ص ۱۲۲

۳۔ طب کی کتاب میں یہ کلمہ مترودلیطوس، مثرودلیطوس، بثرودلیطوس اور مطرودیطوس صورت میں آیا ہے ہدایۃ المتعلمین فی الطب ص ۲۰۱، ۲۵۶۔

بلیس	ابلیس
یلہ	ابلہ
بل	بلہ
یالمند	عیالمند
یان	ہزیان
بنیامین	بن ویامین (نام زوجہ یعقوب علیہ السلام)

درج بالا الفاظ فارسی کے متعدد شعرا نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔ اس ضمن میں ہم چند مثالیں ذیل میں نقل کر رہے ہیں: ظہوری

بیا کی بام کاخ اخنشامش ضرورت کہکشاں را نردباں گوی

شفیعای اثر:

از لطف توام ہر چہ ضرورت است ہیاست

چیزیکہ من امروز ندارم غم فرداست

سلمان[1]

سحاب فیض[2] تو آلودگان عصیاں را . بآب توبہ فرو شست تن ز گرد کدور[3]

حافظ[4]:

حریفی بد مرا ساقی کہ ہر شب[5] ز زلف و رخ نمودی شمس و دی را

۱- دیوان سلمان ساوجی ص ۱۲۴۔

۲- ایضاً: فضل

۳- ایضاً کبر شرور

۴- یہ بیت دیوان حافظ چاپ مدرس ص ۲۷ پہ ہے

۵- ایضاً: ہردم۔

رودکی[1]:

شقاق غالیہ گون است و نیست غالیہ بوی
شگوفہ غالیہ بو نیست و نیست غالیہ گون

متاخرین میں سے کسی نے لفظ عجوبہ اس طرح استعمال کیا ہے :

ای شیخ شہر باکہ توان این عجوبہ گفت
بی پردہ گشت راز نہان از رداء تو

مولوی :

با صد ہزار علم و عمل جان فشان ترین
از عالم سرار با ظہار آمدہ

عرفی[2]

بلہانہ با آفات قدر ساختہ بودم   این عقل فضول آمد و تحقیق سبب کرد

مولوی[3]:

من بلیم خود را اگر زخمی زدم بر خود زدم   ور بطراری ربودم رخت طراری کجاست[4]

سوزنی[5]:

بودم حکیم سوزنی ار چند سال باز   نا یا لمند گشتم و گشتم تحکمی

۱۔ دیوان رودکی ج ۱ ص ۱۹۰۔

۲۔ دیوان عرفی شیرازی طبع نول کشور ص ۱۰۲

۳۔ جہانگیری ص ۸۶ ۱۵: بل احمق و نادان را گویند و آنرا تبازی ابلہ خوانند

۴۔ ایضاً : چہ شد۔

۵۔ رشیدی ص ۲۰ ۱۵۔

فرخی[1]

باسخن تو ہمہ سخنہا[2] یان است　　با ہنر تو ہمہ ہنر ہا مکار

کبھی کبھی کلمہ کے تکرار سے حسن کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حافظ[3]

گر زہندوی شما[4] بر من جفائی رفت رفت

دانشمند خانِ عالی عظیمای نیشاپوری کی غزل کے باب میں اس طرح کہتے ہیں:

قاصد[5] آمد گفتمش آن ماہ سیمین ہر چہ گفت
گفت با مجرم بسازو گفتمش دیگر چہ گفت
ہست عالی از عظیما در غزل سہو عظیم
زانکہ از قاصد بود یک گفت پس دلبر چہ گفت

اس اصل کے آخر میں آرزو نے حرف کے تلفظ میں جو فرق مصوتوں کے ذریعہ رونما ہوتا ہے اس کی وجہ حروف کا حذف کرنا بتایا ہے اور ایسے حذف کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

تیئیسویں اصل:

اس اصل میں لفظوں کے آخر میں جو حرف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔

---

۱. دیوان فرخی ص ۹۶

۲. ایضاً: سخنہا ناقص (۳) دیوان حافظ چاپ انجوی ص ۳۹

۴. گر زدست[؟] زلف مشکینت خطائی رفت رفت ۔ ور زہندوی شما بر ما جفائی رفت رفت

۵. پہلی بیت عظیمای نیشاپوری کی ہے: ملاحظہ ہو فارسی ادب بعہد اورنگ زیب مولفہ نور الحسن ص ۱۳۸ (۶) دیوان: زانکہ از قاصد نپرسیدہ کہ آن دلبر چہ گفت

یہ اصل بائیسویں اصل سے بالکل مختلف ہے یعنی اس اصل میں حرف کے حذف کا بیان ہے، اور اس میں اضافے کا بیان، جیسے ہمگان میں[1] ن کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ ہمگنان ہو گیا، برہان میں ہم عنان کے وزن پر آیا ہے۔ اسی طرح "مند" کے اضافے سے شاد مند فیروزمند، "دان" سے خاکدان، زنخدان۔ بعض کا کہنا ہے کہ مار افسای[2] اور "مار افسا" میں بھی اسی طرح ہے کہ افسای میں ی کا اضافہ اتسایدن سے ماخوذ ہے۔ کبھی کبھی لفظ کے آخر میں جو الف ہوتا ہے خواہ فارسی میں خواہ عربی میں، اس وقت اضافت کی حالت میں ی کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً خدای دراصل خود آ ہے جو واؤ کے حذف کر دینے سے خدا بن گیا، اسی طرح کبریا میں سعید اشرف نے "ی" کا اضافہ کر دیا ہے

از در معرفت در آ تا لم کبریای را

اور کبھی کبھی لفظ کے بیچ میں "ی" کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ فردوسی نے شاہنامہ میں سکندر کے مرثیہ کے ذیل میں لکھا ہے۔

ارسطالیس پیش اندرون   جہانی فرو دیدگان پُر ز خون

اس شعر میں اگر "ی" نکال دیں تو بیت ناموزوں ہو جائے گی۔ اسی طرح غوشا، غوشناک، غوشنا داصلی لفظ ہیں اور غوش ان کا مخفف ہے[3] تشناہ، شناب، شتیابا، شیخ عطار کہتے ہیں۔

۱۔ برہان چاپ معین ج ۴ ص ۲۲۷۱۔ ۲۲۷۲۔

۲۔ جہانگیری ص ۹۲۴، مارافسا، ما یا فسوں و مار افسای افسونگر مار را گویند۔

۳۔ جہانگیری میں ۲۰۲۲ غوشا دبمعنی سرگین آیا ہے نہ کہ وہ جگہ جہاں جانور رہتے ہیں لیکن غوشا د و غوشاک دونوں معنوں میں آیا ہے۔ لیکن برہان ص ۱۴۲۷ پر غوشا و غوشاد و غوشاک تینوں لفظ دونوں معنوں میں درج ہیں۔

گروہی سر بزیر آب بردند   گروہی سر سوی شنیاب بردند
دو استاد صفاہانی باشناب   برون بردند جان از دست غرقاب

اسی طرح کس است، دود و تاہ، فرامش فرامشت، بالش بالشت پاداش پاداشت ہوگیا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے الفاظ مثمر میں درج ہیں جو طوالت کے خوف سے یہاں نقل نہیں کیے جا رہے

چوبیسویں اصل:

اس اصل میں ایک ہی لفظ میں حرف کے تقدیم و تاخیر سے جو فرق واقع ہوتا ہے (اور شاید وہ لفظ جو اس طرح کرنے کے بعد بنتا ہے اصل سے بہتر ہوتا ہے) اس کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اس طرح کی تقدیم و تاخیر حرف ی کے سلسلہ میں بہت زیادہ ملتی ہے۔ مثلاً دریوزہ، اور درویزہ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریوزہ درویزہ کا معرب ہے۔ لہذا شیخ شہاب الدین سہروردی نے اپنی کتاب عوارف[۳] المعارف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دریورش اور درویش، سوزنی[۴]:

۱- جہانگیری میں ۲۲۳۲ مترادفات شنیاب، اشناب، شنا، شناو، شناہ، شناب درج ہے اور رشیدی ص ۱۲۷ میں اشنا، اشناہ، اشناو، اشناب بمعنی شناوری آیا ہے۔ برہان میں ص ۱۲۹۸، ۱۳۲۸ پر شنا و شناب، شناو، شناہ، شنیاب آیا ہے

۲- جہانگیری ص ۲۳۳۱ پر شناہ کے طور پر شنیاب آیا ہے۔

۳- یہ کتاب عربی اور فارسی میں کئی بار ترجمہ ہو چکی ہے فارسی کا قدیم ترین ترجمہ قاسم داؤد کا ہے جو تقریباً ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء اور ۶۲۳ھ/۱۲۲۵ء کے درمیان وجود میں آیا ہے اس کا نسخہ علی گڑھ [illegible] میں موجود ہے۔ [illegible] جہانگیری ص ۲۹۹ رشیدی میں ص ۲۲۲ میں ناصر خسرو کی بیت شاہد کے طور پر آئی ہے۔

ای بخلق بشر بخلق سروش — بهتر جود و رزو دانش کوش
بتوانگر دلی و کفّ جواد — نخوہی ماند درجہان درویش

دریوش مرکب ہے درا اوریوش جس کا مبدل[1] یوز بمعنی جوینده کے ہیں۔

موی و میبو، پور بہاء[2]

دودست نوشل به دوش تو کرد — دو چشم تو بی نور و پر میبو به

بہاشم و بلاشم بمعنی زشت و نازیبا، نزاری قہستانی[3]:

جہانی زجودِ تو بستند خشم — قرین تکلف غریق تنعم
گر از خرده بینان بخرد نباشم — نباشم هم از ابلہان بہاشم

انوری[4]:

[5]من هرچه گونه باشم بیکار کی نباشم — یا چیز کی نویسم یا شعر کی تراشم
خطی[6] نه سخت نیکو خطی ازین میانه — شعری نه نیک عالی شعری ازین بلاشم

---

(۱) رشیدی ص ۶۶۲: دریوز بمعنی گدا یعنی جست و جو کنندۂ در، چه یوز بمعنی جوینده و جست و جو آیا ہے (۲) جہانگیری ج ۲ ص ۸۴۳: میو مو کے معنوں میں آیا ہے اور شعر میں مصرعۂ اول متن سے گرا ہوا تھا (۲) جہانگیری کے ذریعہ اس کی تصحیح کی گئی۔

(۳) جہانگیری ص ۲۱۹۔ شاہد بہاشم بمعنی چیز بد و زشت و نازیبا و دون۔

(۴) دیوان انوری ص ۶۸۹، بعنوان نکتۂ موزون۔

(۵) ایضاً۔ جائی که من نشینم بیکار کی نشینم۔ یا خط کی نویسم یا بیت کی تراشم

خطی نه سخت نیکو زیبا خطی بلایه — زین شعر کی نه نیکو بل شعر کی بہاشم

میرے خیال میں آرزو نے یہ ابیات جہانگیری ص ۲۷۱۳ سے نقل کی ہیں کیونکہ جہانگیری اور متن دونوں میں دیوان انوری سے کچھ زیادہ فرق ملتا ہے۔

میان اور نیام یعنی غلاف شمشیر:

دست فال[1] و دست لاف[2]

آبشخور، قلب آبخورش[3] بمعنی قسمت و روزی، حافظ[4]:

بخت بد بین کہ کجا می برد آبشخور ما

کمال اسماعیل[5]:

ہر کجا باز سر رایت تو سایہ فکند　　کبک و شاہین ہم آیند سوی آبشخور

چشم اور چمیش، فردوسی یوسف زلیخا[6] میں اسے استعمال کرتا ہے:

۱۔ جہانگیری ص ۱۲۹۸، رشیدی ص ۱۷۶، برہان میں ۸۶۱، دست لاف سودای اول را گویند کہ از آن شگون گیرند۔ ظہوری کی یہ بیت پہلی دونوں فرہنگوں میں مثال کے طور پر بیان ہوئی ہیں:

تا شب در سودای طرب لبتہ شود　　با غم روزی کہ دست لافی نکنم

۲۔ رشیدی ص ۱۷۶، برہان ص ۸۵۹، رشیدی میں مندرجہ ذیل بیت مثال کے طور پر استعمال ہوئی ہے:

دست فالی کہ جر داو کردہ　　گرد از مہر و کان برآوردہ

۳۔ اصل کلمہ آبخور ہے نہ کہ آبخورش جیسا کہ مندرجہ ذیل ابیات سے ظاہر ہوتا ہے: (دیوان خاقانی ص ۵۹۸)

قطران: ترسم کہ برآید ز جہان آبخور من　　کز شہر برآورد جہان آبخور ما (یعنی نصیب)

خاقانی: در غمت ای زدد سیر خون جگری خورم۔ تشنہ بجز من کہ دید آبخورش آتشین

رشید اعور: بیار منت دریڈ و استاد در زئی۔ چو کوزہ گر نہ کنج ہمی آبخور کنی (یعنی مشربہ)

حافظ: ساختہ از دلو چرخ لاجوردی آبخور

مسعود سعد سلمان: زحوض دگر بی منت آبخور

معزی: آیند گرگ و میش بہم سوی آبخور

بکردار چمش[1] گوزمان دو چمش   ہمہ سحر دخوبی[2] ہمہ رنگ دنمش

ہوشیار وھشیوار، فردوسی[3]:

خبر داشت لختی سشہ[4] کاردان   ہیشوار و باہنگ بسیار دان

ہوشمند و ہشومند، فردوسی[5]:

زتخمی[6] کہ کشتی درین رود بار   ترا داد ای نا ہشومند بار

زرادشت وزرادشت، زراتشت وزراتشت نام پیغمبر مجوس، بوشیاس

و بوشاسپ بمعنی خواب، ذرآہنگ[7] ودژہ آنگاہ، شب آہنگ[8]، شباگاہ، استرآباد و

استارباد مازندران کے شہروں میں سے ہے: منوچہری[9]

تا طرب وسطرب است مشرق وتا مغرب است

تا یمن ویثرب است آمل استارباد

یلارک ویرالک، نظامی[10]:

بقیہ ۲۱۳ فردوسی وہمی داشت بر آبخور پای خویش (جہانگیری متن اور حاشیہ ص ۲۷-۳)
اس وجہ سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ آبخورش کا شین واحد غائب ہے
نہ کہ کلمہ کا جزو۔ میری نظر میں آرزو غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ دوسرا لفظ آبخور ہے
(جہانگیری)

(۴) دیوان حافظ چاپ انجوی ص ۸، جہانگیری ص ۸۱:

مابرفتیم وتو دانی ودل غمخوار ما   بخت بد تا بکجا می برد آبشخور ما

(۵) اسی بیت کو جہانگیری نے مثال کے طور پر لکھا ہے لیکن دیوان کمال اسمٰعیل میں میری نظر
سے نہیں گذرا (۶) تاریخ ادبیات در ایران ج ۱ ص ۸۹ و شیرانی: فردوسی پر چار مقالے۔

۱- جہانگیری ص ۱۶۸۹، رشیدی ص ۸۳۵ (۲) ایضاً: شوخی (۳) جہانگیری ص ۱۴۱۶،
ہشوار و ہشیوار، رشیدی ص ۱۴۹۰ ہشوار و ہشیور و ہشیوار تینوں صورتوں میں موجود ہے
(۴) جہانگیری: وشیر (۵) جہانگیری ص ۱۴۱۶، رشیدی ص ۱۴۹ شاہد ہشومند
(۶) ایضاً: ازان تخم کشتی بد پر روزگار الخ
(۷) فرہنگ دساتیر ... ص ۵۲ ذر آہنگ، دژ آنگاہ کے معنوں میں ہے ...

بدریا چون زند گرز[1] پلارک — بماهی گاو گوید کیف حالک

هرگز اور هگرز، ناصر خسرو[2]:

مردمی ورز و هگرز آزار آزاده مجوی — مردم آن را که آن آمادهٔ آزار نیست

گردن بند و گردبندان، رودکی[4]

بهر کار[5] جهان چون[6] گرد بندن — تو چون یا توت سرخ اندر میانه

تقیہ ۲۱۴ - لیے یہ بیت ہے:

شب آهنگ چون برزد از کوه دود — برآهنگ شب مرغ دستان نمود

(۹) دیوان منوچہری ص ۲۰

(۱۰) جہانگیری ص ۵۹۴ اور رشیدی ص ۳۳۹۔

۱۔ رشیدی ص ۳۳۹: تیغ، جہانگیری ص ۵۹۴:

چو بر دریا زند برق پلالک۔

(۲) دیوان ناصر خسرو۔ چاپ تہران ص ۷۶۔

(۳) دیوان اور جہانگیری: کز و آزاده را۔

(۴) دیوان رودکی، ج ۳ ص ۱۰۷۰ چاپ نفیسی۔

(۵) ایضاً: بزرگان

(۶) مثمر: چو

بلغور و برغول یعنی آش جو کہ جو اور گندم کو پکانے سے بنتا ہے۔

مرغزن اور (۱) **مرزغن** شمس فخری (۲)

شاہی کہ بر مخالف درگاہ خویشتن — از کشتہ (۳) مرغزار کند ہمچو مرغزن

اغلکند و واخکلندر و شمس فخری (۴)؛

ظفر از رایتت دل شاد باشد — بسان طفلگان از اخللکندو

---

(۱)۔ ان دونوں لفظوں کے لیے استاد ہنگ نے ایک مفید مقالہ لکھا جس کو برہان میں ص ۱۹۹۱ - ۱۹۹۲ - ۱۹۹۳ کے حاشیوں میں محمد معین نے اضافہ کیا ہے۔ میں اس کو یہاں نقل کر رہی ہوں۔ استاد ہنگ لکھتے ہیں: در فارسی ما دو کلمہ داریم، مرغزن و مرزغن (گور، قبرستان) کلمہ دوم در یک بیت عنصری شاعر مقدم عہد محمود غزنوی با زغن (لاشہ خور؛ یا گوشت ربا) قافیہ آمدہ: ہر کہ را راہبر زغن باشد — منزل او بمرزغن باشد

(اسدی چاپ ہرن ص ۱۰۵؛ چاپ اقبال ص ۳۶۲) بشکل دیگر یعنی مرغزن را اما با کلمہ مرغزار" نوعی بازی کلمات (جناس) را ایجاد می کنند، اما ہروی شاعر قرن ۷ ہجری گوید:

آن جہانداری کہ گشت اندر نبرد — مرغزار از زخم تیغش مرغزن (اما ہروی فرہنگ جہانگیری و شمس فخری (قرن ۸ ہجری) این بیت را چندان ابتکاری نیست، گفتہ:

شاہی کہ بر مخالف درگاہ خویشتن — از کینہ مرغزار کند ہمچو مرغزن طبع را

مرغزن (فرہنگ رشیدی) بہتر از مرغن (فرہنگ جہانگیری) است و سنائی (در قرن ۶ ہجری) در بیتی کہ شاید بار اول است کہ مرغزن با مرغزار آوردہ شدہ گوید: ہیچ نندیشی کہ آخر چون بود انجام کار — مرغزار آید جزای فعل تو یا مرغزن مراد آنست کہ نگرمی کنی کہ با پایان کار تو چیست و در نتیجہ اعمال خود بہ مرغزار (بہشت خواہی رفت یا بگورستان (دوزخ) رشیدی این بیت سنائی را برای معانی دو نسخ

[illegible]

چسپیدن چیسپیدن چراگاہ وچارگاہ غاو وش دغاو شو، سگلیدہ وگسلیدہ، گسترہ و سگستہ، شلم وشمل، کنار دکران، شلغم وشملغ، پرویز و بیروز، خوی وخیو، کفت کتف، دلو ودول، ورتاج وتاجور، سوزنی[1]

تو تاجور ملک شرف بادی اعدات — بر آتش غم سوخته باد ند چو ورتاج

پچیسویں اصل

اس اصل میں مصنف نے ابدال کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے یعنی ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دینا۔ ابدال کے دو طریقے ہیں:

۱۔ ایک لفظ میں ایک حرف کا ایک بار سے زاید بدلا جانا جس کو بدل البدل کہتے ہیں یہ طریقہ عربی میں بھی معمول ہے۔ فارسی میں لفظ انباز دہمباز دہنباز بمعنی شریک، با یہ ودایہ ومایہ بمعنی ضروری، فلکی شروانی[2]،[3]

زان بوسہ بوسۂ او دایۂ روان — زان غمزہ غمزۂ ادمایۂ عذاب

زرو وزر، لو وشلو، آباد وآماد وآوار، آرنج وآرنگ ووارنج، ارننگ وارچنگ وارژنگ وارسنگ، اتچ وہیش دہیچ، شیخ الاسلام[4]:

ہر کہ آمد ہر کہ آید می رود[5] — این چنان محنت سرای بیش نیست

احمد جامی ترا بندی دہد — آخرت را باش دنیا ہیش نیست

۱۔ دیوان حکیم سوزنی چاپ شاہ حسین ص ۱۳۶، جہانگیری ص ۸۲۸، رشیدی ص ۱۲۵

۲۔ دیوان فلکی شروانی چاپ آذر ص ۲۶

۳۔ دیوان فلکی: زین

۴۔ یعنی شیخ احمد ژندہ پیل۔ انہیں ابیات کو جہانگیری میں ۲۰۶۷، رشیدی ص ۱۲ ۱۵ آیا ہے

۵۔ جہانگیری۔ رشیدی: بگذرد۔

حکیم سنائی[1]

خلق جز[2] مکرو بندد، ہیچ نیند   ہمہ را آزمودم اتیج نیند

اسی طرح بیرزہ، بیرزد[3]، بیرزی[4]، سیف اسفرنگی[5]

شاکراند ارباب معنی زینکہ باری زینہار   می شناسی بیرزی از گوہر د سوسن سپیر

مسعود سعد سلمان[6]:

ہیچو ما زو رفت شان نفیح وسیہ چون بیرزہ   چون ہلیلہ زرد شان روی و ترش چون املہ

لیلوپہ	نیلوفل	نیلوفر
آرین	آذین	آئین
آوریشہ	آوریشم	آدیشن
کلادہ	کلافہ	کلابہ
کاشغر	کاچغر	کاژغر
کنو	کنب	کنف
ہوش	لوخ	لوس

۱۔ جہانگیری ص ۱۷۵۸

۲۔ ایضاً جز ہمہ بندد، ہیچ الخ

۳۔ ہدایۃ المتعلمین فی الطب۔ ص ۳۲۶

۴۔ جہانگیری ص ۲۲۲۳، رشیدی ص ۲۷۳: بیرزد، بیرزہ و بیرزی صمغی است مانند مصطکی الخ

۵۔ جہانگیری ص ۲۲۲۴

۶۔ ایضاً دیوان ص ۴۸۲ پر پہلا مصرع اس طرح ہے: ہیچو ما زو روی شان نغج و سیہ چون تدرو

قلماسنگ	قلاسنگ	قلماسنگ	قلاسنگ
زگال	سگال		زغال
کرغست	درغست		برغست
بوم	کوف		بوف
لنج	کنج	رخ	دخ
الفغدن	الفخدن	الفخدن	الفختن
ابگندن	اوگندن		اُگلندن
چپیدن	چفسیدن		چوسیدن
ارج	ورج		فرج
ارنج	ارغر		ارغک
لجن	لثرن		لشن
ترنده	نرونده		ترگنده
نام	بام		وام
ریواس	ریواج		ریباج
کچکول	کشکول		خچکول
سرآگوش	سراغوش		سراغوج
زربان	زرمان		زرقان
زندباف	زندواف		زندلاف
خانزغان	قازغان		قازقان
خرفس	خسروه		خروج
سمارغ	زماردغ		سماردخ

شارو — شارخ — شارک

کلغونہ — بلغونہ — ملغونہ — دلغونہ

ہجیر — ہژیر — خجیر

چُک — چر — چل

انگدان — انگوان — انگبان — انگیان

اس اصل میں الفاظ کی ترکیب میں جو ردو بدل ہوئے ہیں آرزو نے سب کو خوب جانچا اور پرکھا ہے اور ان کو غلط طور پر مطالعہ کی وجہ سے ان کی اپنی اصل کی بگڑی ہوئی شکل بتایا ہے

چھبیسویں اصل

یہ اصل بہت مختصر ہے اس میں امالہ کے مسئلہ سے بحث کی گئی ہے یعنی حرف "الف" کو "ی" میں تبدیل کرنا خواہ فارسی کے لفظ ہوں یا عربی کے مثلاً

اعتماد — اعتمید

آزار — آزیر

آباد — آبید

حکیم روحانی:

کشتہ از فیض تابش خورشید کوہ و در سبز بوم و بر آبید

انوری[1]

درجہان چندان کہ خواہی[2] بی شمار نیستی و محنت و آزیر[3] ہست

وز فلک چندان کہ جوئی[4] بی قیاس نفرت آہو و خشم شیر ہست

---

(۱) جہانگیری ص ۱۱۸ (۲) دیوان انوری: گوئی (۳) دیوان: ادبیر، حاشیہ میں ادبار ہے لیکن جہانگیری اور رشیدی نے اسکو آزیر پڑھا اور اسکو آزار کا امالہ سمجھا (۴) دیوان: خواہی

حجاب۔ حجیب، مولانا جامی:

تا ماہ رویم از من رخ در حجیب دارد   نی دیدہ خواب دارد نی دل شکیب دارد

آرزو کے نزدیک امالہ صرف اسم میں جائز ہے۔ افعال میں نہیں ہے۔

ستائیسویں اصل

اس اصل میں فارسی زبان میں ہندی الفاظ کے استعمال کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں آرزو نے نہایت منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ آرزو کہتے ہیں کہ عربی ترکی اور ارمنی زبان کے الفاظ فارسی میں نہایت کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اور ان کا استعمال جائز سمجھا گیا ہے۔ رہ گیا ہندی الفاظ کا مسئلہ تو مولف کے نزدیک ہندی الفاظ بھی بلا تکلف استعمال کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اساتذہ کے کلام میں اس طرح کے ہندی الفاظ فارسی میں کھلم کھلا استعمال کیے گئے ہیں، مثلاً سنائی کا یہ شعر ملاحظہ ہو[1]:

نہ در آن معدہ خدرۂ میدہ   نہ در آن دیدہ قطرۂ پانی

جس طرح فارسی میں عربی اور ترکی محاورات خوب استعمال ہوئے اور ہر لفظ اپنی جگہ مسلم ہے پھر ہندی الفاظ کا استعمال کیوں نہ جائز سمجھا جائے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ فارسی پر عربی کا تسلط اس وقت سے زیادہ ہوا جب عربوں کا ایران پر قبضہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ چونکہ عربی دینی زبان کی حیثیت بھی رکھتی ہے اس لیے بھی عربی کا فارسی پر اثر پڑا۔ یہ اثر اتنا گہرا ہے کہ اکثر عربی الفاظ نے قدیم فارسی الفاظ کی جگہ لے لی ہے۔ اور اس طرح فارسی کے الفاظ متروک اور

۱۔ رشیدی ص ۲۳۷: پانی اگرچہ ہندی ہے لیکن سنائی نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو دیوان سنائی ص ۱۴۱۳، چاپ مصفا (۲) دیوان سنائی: زنبرہ ای ماندہ

اور ان کے جانشین عربی کے الفاظ متداول ہوئے یہی ترکی زبان کے ساتھ ہوا کہ وہ بھی فارسی زبان کے ساتھ مخلوط ہوگئی، یہاں تک کہ ترکی کے الفاظ کی جگہ دوسرے فارسی الفاظ ملتے ہی نہیں ہیں مثلاً تورچ پاشی" وہ ایشک آقاسی باشی" وغیرہ بمعنی وہ شخص جس کے اختیار میں فوج ہو جس کو ہندستان میں میر بخشی کہتے ہیں یہ دونوں دربار کی اصطلاح ہیں۔

اٹھائیسویں اصل

اس اصل میں مولف نے اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ جب عربی اور ہندی الفاظ فارسی میں استعمال کیے گئے تو ان کو تبدیل کر لیا گیا۔ انہوں نے اس عمل کو عمل تفریس کا نام دیا ہے یعنی دوسری زبان کے الفاظ کو فارسی زبان کے الفاظ میں تبدیل کرنا۔ یہ تبدیلی مفرد اور مرکب دونوں الفاظ کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ فارسی میں اس پر عمل پیرا ہوتے وقت بلاغت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور ان کے اصلی مصادر کے آخر میں (ی دن)، کو جوڑ کر فارسی مصادر بنالیا گیا جیسے طلب سے طلبیدن، رقص سے رقصیدن، فہم سے فہمیدن وغیرہ۔

اس طریقہ سے عربی مصادر سے جو فارسی مصادر بنائے گئے آرزو نے اس کی بہت کم مثالیں دی ہیں اس لیے ہم بھی اسی بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ صرف انہیں مصادر کا ذکر کریں جن کو فارسی کے قالب میں ڈھال لیا گیا ہے مثلاً تمیزد ماخوذ ہے تمیز سے جس کے معنی "از ہم شناختن" ہیں، سالک یزدی نے اس لفظ کو اپنے کلام میں اس طرح استعمال کیا ہے:

سالک بفروشید بما بادۂ صافی کو ذائقہ محتسبی تا تمیزد

لفظ سیر صیغۂ امر اور حال میں آیا ہے جیسا کہ عرفی کہتا ہے[1]

بگیر تحفۂ نظمی کہ زادہ از طبعم ودود لبیزو مینندیش کین لطف نہاد[2]

طلوعیدن :- یحییٰ کاشی شیرازی الاصل شاعر ہے اس نے طلوعیدن کا لفظ اپنے ایک شعر میں استعمال کیا ہے مثلاً :

شد موی سفید و جرم نیست ز غفلت چون خفتہ کہ غافل ز طلوعیدن صبح است

نظامی نے غارتیدن اس شعر میں استعمال کیا ہے :

جھودی مسی را زرا ندود کرد دکان غارتیدن بر آن سود کرد

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مصادر میں عمل تفریس کے سلسلہ میں تھا۔ کبھی عمل تفریس اسم میں بھی کیا جاتا ہے مثلاً غرارہ عربی میں غرغرہ ہے جس کے معنی پانی کو گلے میں گھمانا ہے ؛ حافظ کا مندرج ذیل شعر ملاحظہ ہو :[3]

اگر گہی نزبانم حدیث تو برود زبی طہارتی آن را بمی غرارہ کنم[4]

غدہ، سدہ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسی چیز جو جسم میں کہیں گردہ کے مانند پیدا ہو جائے، اہل فارس اسے غدود کہتے ہیں، نصیرای بدخشانی :

۱۔ دیوان عرفی ص ۳۰

۲۔ ایضاً : سہل میندیش۔

۳۔ جہانگیری ص ۱۰۵۴، دیوان حافظ چاپ سب رنگ کتاب گھر دہلی ص ۲۹

۴۔ دیوان حافظ بشبی

خدنگ غمزہ گشای تو با یدم کہ غمت
درون سینہ گرہ گشت چون غدود مرا

عربی محاورات اور مرکبات میں تبدیلی، یعنی عربی عبارتوں میں حروف یا کلمات کی کمی کر کے انہیں فارسی میں استعمال کرنا مثلاً الحی میں سے الف و لام نکال دیا۔ نظامی[1]

برآ ورد مؤذن در اول قنوت
سبحان حی الذی لا یموت

کبھی ایک لفظ میں تبدیل کر کے یعنی "لہم" بجائے الذین کفروا"
جامی[2]: نقد عمر زاہدان در توبہ بگسیختہ[3] تلف - قل لہم ان ینتہوا یغفر لہم ما قد سلف

موالف کے نزدیک اس طرح کا تصرف کلام الٰہی میں کرنے سے کفر کا مرتکب ہو سکتا ہے، کمال خجندی[4] لفظ مع بجائے الی کے لائے ہیں:

سرو مایل بقد پست چہ حاجت دلیل
ہمہ دانند کہ الجنس مع[5] الجنس یمیل

کبھی لفظ زیادہ کر کے بھی تصرف کیا ہے۔ جامی:

زد شیخ شہر طعنہ بر احوال اہل دل
المرء لا یزال عدو لما جہل

اسی طرح سیخرج المرعی بجائے اخرج المرعی

فارسی الفاظ کو کبھی عربی کا جامہ پہنا کر تصرف کرتے ہیں۔ مثلاً ذوالخورشیدین)، والہ ہروی:

تا مہر تو گشت نور افشان
ذوالخورشیدین شد خراسان

۱۔ شرفنامہ گنجوی ص ۷ (۲) دیوان جامی چاپ ہاشم رضی ص ۷۰۸
۳۔ ایضاً: ۔ از می شد
۴۔ دیوان کمال خجندی چاپ تبریز (چاپ خانہ شفق) ص ۲۴۰
۵۔ ایضاً: الی۔

ہنگ البحر، پلنگ الجبل، انا الیار، عالی:

گل مگر لاف انا الیار زدہ در گلشن — بر سر شاخ خیال سر منصور کنم

عند الخواہش، حسب الفرمودہ۔

کبھی فارسی لفظ میں، عربی کے طریقہ سے صیغہ بناتے ہیں جیسے متّرش جو تراشیدن سے ماخوذ ہے۔ مفید بلخی:

ہر گل کہ خار خار طمع سر زند از د — در دیدہ بد قماش چو دوی متّرش است

فلاکت از فلک، اسی طرح لفظ "ماثور" و مرسول، عرفی(۱):

قضا بحاکم دانش نوشتہ مصلحتی — فلک ندیدہ کہ مرسول او چہ مضمون است

در بدنامہ نخشم و بروی قاصد زد — کہ مصلحت بکہ می سنجد این نہ گردون است

مگر ز لوح قلم گوش کن کہ گو یندش — کہ امر و نہی کہ مصداق امر بیچون است

اسی طرح،

اگرچہ ہست مبرہن کہ مسیر وجود — موثر اند صفات الہٰی ماثور

فارسی زبان میں ایک قسم کی تبدیلی اس طرح کی جاتی ہے کہ بجائے ابن فلان و ابو فلان کے فلان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ابراہیم بن ادہم کو صرف ادہم، اسی طرح حسن بن منصور کو منصور، سبکتگین بجائے پور سبکتگین،

کمال خجندی(۲):

چون بنظارہ آمدم روز شکار دلبران — دام دل سبکتگین زلف ایاز یافتم

۱۔ دیوان عرفی ص ۶۵

(۲) دیوان کمال خجندی ص ۲۴۴

طالب کلیم بجائے ابو طالب کلیم، وقاص بجائے سعد وقاص، خواجہ شیرازی[1]:

ناوک غمزہ او دست بہر دانہ ز تستم　　حاجب ابروی او بر دگر واز وقاص

ابھی تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عربی کلام میں فارسی زبان کا تصرف تھا۔ اب یہاں کچھ ایسی مثالیں دی جا رہی ہیں جہاں خود فارسی میں بھی تصرف کیا گیا ہے۔ عنصری[2]!

گر عیب[3] سر زلف بت از کاستن است　　کی[4] جای بغم نشستن و برخاستن است

وقت طرب و ہوای می خواستن است　　کاراستن سرو بہ پیراستن است

انتیسویں اصل

یہ اصل ہندی الفاظ کو فارسی میں تبدیل کرنے سے متعلق ہے۔

فارسی شعرا اور مصنفین نے ہندی الفاظ میں تبدیلیاں کر کے ان کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ تبدیلیاں دو طرح سے کی جا سکتی ہیں، اول حرف یا حروف میں تبدیلی کر کے جیسے ذات بجائے جات کے، طغرا مشہدی[5]:

شوخ سوسن را مگو دل می ربا ید شفقہ اش　　ذات رجپوت است ترسم دست بر جمدھر کند

اسی طرح کنالہ، کنارہ، بجائے کٹارہ کے، ناصر خسرو[6]:

---

(۱) دیوان حافظ ص ۲۶۵۔

(۲) دیوان عنصری ص ۱۸۸

(۳) ایضاً: کی، لیکن دیوان کے حاشیہ پر: مگر

(۴) ایضاً: چہ حاشیہ میں: کی

(۵) ایضاً: روز، حاشیہ: زفتہ

(۶) جہانگیری ص ۲۹۶، آخری بیت رشیدی میں ص ۲۰۳!! پر، دیوان ناصر خسرو ص ۴۸۸

تا گل در کلہ چون عروس نہاں شد — ابر متناظرت است و باد دلالہ
نرگس تماشی چون بلا لنگہ کرد — بید برآہیختہ سوی لالہ کتارہ[1]

امیر خسرو:

سرآن دو چشم کردم کہ چوں ہندوان رہزن
ہمہ را بنوک مژگان زدہ برجگر کتارہ

دوم حرف یا حروف میں تقدیم کر دینا اور اسی لفظ میں کسی حرف یا حروف کو حذف کر دینا جیسے جیسلمیر کے بجائے جیرمیر طغرا:

تو چرا اگر جیرمیر آید بگلزار بہشت — از نزاکت جابرد ئی دیدہ جوہر کند

متھرا کے بجائے متورہ، غالباً یہ شعر بھی طغرا کا ہی ہے:

چون زند سر متورہ حرفی از پازند حسن — بہر زیب نطق مصحف خوان گل از بر کند

اسی طرح لفظ دیوالی کے بجائے دوالی، محسن تاثیر کے اس شعر میں اس طرح استعمال ہوا ہے:

از بادہ چراغ کردہ روشن — چشم تو ہندوی دوالی

جھکڑ کے بجائے جکر، عرفی شیرازی[2]

در چاشتگہ از شبنم گل گرد فشان است — آن باد کہ در ہند گرآید جکر آید

تیسویں اصل

یہ اصل توافق لسانین سے متعلق ہے یعنی فارسی و عربی، فارسی و ہندی یا فارسی و عربی و ہندی کے ایک ہونے کا نظریہ جیسے ہندی کا ڈول عربی اور فارسی میں دول اور دلو بمعنی بالٹی ہے۔ عام الفاظ میں رد و بدل

۱۔ تاریخ بیہقی میں ۲۲۹، کتارہ بھی اسی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ دیوان عرفی ص ۳۶۔

کے بارے میں آرزو کا خیال ہے کہ نقطہ دار اور غیر نقطہ دار حروف اور خاص طور سے کسی زبان کا حرف ذاتی تبدیلی نہیں کر سکتا ہے ان خیالات کے کے اثبات میں آرزو نے کچھ الفاظ کا ذکر کیا ہے جیسے دست کا سین غیر نقطہ دار عربی حرف ہے اور دشت کا شین نقطہ دار فارسی ہے اور دونوں کے معنی ریگستان ہیں۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ اگر الفاظ لہجے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں اور وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوں تو اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے مثلاً ستراجو کہ پہلوی لفظ ہے اور جس کے معنی بارش کے ہیں اور مطرا جو کہ عربی ہے اور جس کے معنی بھی بارش ہی کے ہیں۔ اسی طرح میا ایک پہلوی لفظ ہے جس کے معنی پانی ہیں اور ماء عربی لفظ ہے لیکن اس کے معنی بھی پانی کے ہیں۔

اکتیسویں اصل

یہ اصل مثمر میں بہت زیادہ طویل ہے۔ اس میں عمل تعریب سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث مزہر[1] کی سیوطی کے طرز پر ہے۔ آرزو نے ان الفاظ کا جن کو مزہر میں سیوطی نے بیان کیا ہے اور ان الفاظ کے متعلق جو فارسی اور عربی میں بیان ہوئے ہیں تنقیدی جائزہ لیا ہے مثلاً لفظ، کوز، جو فارسی اور عربی میں یکساں استعمال ہوا ہے۔۔ کبھی کبھی فارسی میں لفظ کے آخر میں (ہ) زیادہ کر دیتے ہیں جیسے خان و خانہ

بتیسویں اصل

اس اصل میں توافق الفاظ کے بارے میں بیان ہوا ہے یعنی ایک لفظ کا اشتراک دو زبانوں میں یا اس سے زیادہ زبانوں میں

یعنی عربی، فارسی اور ہندی مثلاً کلال وکپی، ماس و ماہ۔ انگشت وانگشٹ، جاروب وجھاڑو، اشتر واشتر، لنکن ولنکھن ہسنائی[1]:

لنکست گر کند ترا فربہ   سیر خوردن ترا ز لنکن بہ

اسی طرح بنگالا جس کو فارسی میں بنگالہ لکھتے ہیں، حافظ[2]:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند   زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی طرح مالوہ اور راجپوتانہ جس کو اب ہائے مختفی سے لکھتے ہیں عہدِ اورنگ زیب[3] عالمگیر سے پہلے الف سے لکھا جاتا تھا۔

بھو بوزن سبو، لیکن یہ بو بھی ہو سکتا ہے۔ اسدی[4]:

سبکسار[5] بر قلب لشکر زدند   ربودن شان بر[6] بھو در زدند

اسی طرح بھیم بوزن فہیم، فرخی:

چو نہروالہ کہ اندر دیار ہند بہیم   بہ نہروالا ہمی کرد بر شہان تقدیم

سنگھ و سنگ، یحییٰ کاشی:

سر راجپوتان جگت سنگھ بود   کہ بر شیشۂ نہ فلک سنگ بود

متعدد ہندی الفاظ کی تفریس کی گئی ہے مثلاً بھو و بھیم و سنگھ، بھروچ وبروچ۔ گر بہ سوت گرمسوت، محسن تاثیر:

سخن تنداز قماش لفظ بی مضمون نمی گردد   کہ گرمی از لباس گرمسوت افزون نمی گردد

اسی طرح کچہری جو کہ کچھڑی ہے، مالک یزدی:

سیر گشتم ز کچری ایام   ہوس خون و سیم و زر نکنم

---

(۱) حدیقۂ سنائی ص ۶۸۵   (۲) دیوان حافظ ص ۸۶

(۳) عہد اورنگ زیب ۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء تک (۴) جہانگیری ص ۲۱۵۸

(۵) ایضاً: بیکبارہ   (۶) ایضاً: بر

کھنڈی ظہوری:

ز چو کھنڈیش سایہ بر آفتاب   ز راز سر افزایش در حساب

نکر: جو کہ ہندی میں انکس ہے۔

بعض الفاظ میں یہ اشتباہ ہوا ہے کہ انہیں ہندی زبان سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ وہ فارسی الاصل الفاظ ہیں، جیسے چال س کے معنی ہندی میں چلنے اور چال کے ہیں لیکن یہ لفظ چلیدن مخفف ہے۔ امیر خسرو(۱)

من خود نمی جلم تو اگر می چلی بچل   ز چل چل تو پای من زار شد کچل

ماری بمعنی بیرتی، مار سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہندی میں گردن(۲) ہے،

سناد عسجدی(۳)

بصحراش چون مار وکژدم بماری   اگر ماری دکژد می است طبعش

تینتیسویں اصل

یہ اصل لفظوں کے حقیقی اور مجازی معنی کے بارے میں ہے۔ یہ وری بحث سیوطی کی مزھر(۴) پر مبنی ہے۔ آرزو کے مطابق الفاظ کو اگر اس کی وضع کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے تو وہ حقیقت ہوتا ہے اور اگر اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس کو مجاز کہتے ہیں اسی طرح اگر تشبیہہ حقیقی لفظ کے ساتھ درمیان میں استعمال ہو تو وہ استعارہ کہلاتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ مجاز مرسل ہوتا ہے، نظامی:

۱۔ جہانگیری ص ۱۶۱۷: چل امر از رفتن بود، بزبان ہندی نیز بہمیں معنی مستعمل است، امیر خسرو

اگرچہ غرقہ از فضل او نمید مباش   بعلم کوش در این غرق چیل بیرون چل

(۲) جہانگیری ص ۱۹۱ - ۲۰۹۲ - (۳) جہانگیری ص ۲۳۷

پای سخن را کہ دراز است دست سنگ سراپردۂ او سر شکست

اس جگہ پای سخن کو دست دراز ثابت کرنا اس کے بعد سر شکست کا اس پر اطلاق کرنا کوئی بھی محاورہ کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح

شور رقص الجمل آرد بطرب بادیہ را زاہد از جا چہ دلآید چہ تماشاست کہ نیست

بادیہ سے مراد اہل بادیہ ہے جیسا کہ علمار ہند لکھتے ہیں لیکن بجائے بادیہ قافلہ بہتر ہوتا ہے۔ آرزو کے خیال میں فارسی میں بھی اسی طرح ہے۔ اسی طرح درج ذیل اشعار میں "چو" میں "من" حذف کیا ہے:

چاکرانت بگہ رزم چو خیاطانند گرچہ خیاط نیند ای ملک کشور گیر

بگز نیزہ قد خصم تو می پیمایند تا ببرند بہ شمشیر و بدوزند بہ تیر

انوری کا یہ شعر بھی اسی طرز عمل کی مثال[1] ہے

مقدری نہ بآلہ[2] بقدرت مطلق کند بشکل نجاری چو گنبد ازرق

گنبد ازرق سے مراد فلک ہے۔

چونتیسویں اصل

اس اصل میں مولف نے ایک لفظ کے معنی میں جو ترادف اور تضاد پایا جاتا ہے اس سے بحث کی ہے اگر دو لفظ دو مختلف معنوں کے لیے استعمال کیے جائیں ان کو تباین کہتے ہیں جیسے مردم اور اسپ۔ اس طرح کے الفاظ کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیز کے لیے جو مختلف نام استعمال کیے جاتے ہیں ان کو مترادف کہتے ہیں مثلاً تیغ و شمشیر و نیزہ و خدنگ۔ اگر مختلف معنوں کے لیے ایک ہی لفظ ہو اس کو مشترک کہتے ہیں جیسے فارسی زبان میں لفظ آباد یوزن آزاد جس کے معنی معمور ہیں اور عوبرانے

---

۱ دیوان انوری ص ۱۷۴ (۲) ایضاً: بآلت

کی ضد ہے۔ لفظ چشمہ جس کا ترجمہ آنکھ ہے، چشمۂ آب و چشم آفتاب، و چشمۂ عینک، چشمۂ دام و چشمۂ پل، چشمۂ سوزن، چشمۂ متاع، چنانچہ صائب کہتے ہیں:

از انتظار دیدۂ یعقوب یافتن   یک چشمۂ متاع بد از کاروان مرا

مشترک کی ایک قسم ضد ہے یعنی ایک کلمہ کے دو معنی۔ مولف کے قول کے مطابق یہ قسم فارسی میں بہت کم ہے۔ یہ ان لفظوں میں پائے جاتے ہیں جو کسی بھی حالت میں ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہو سکتے۔ بعض عربی علما، توافق الفاظ کی موافقت نہیں کر سکتے جیسے درسویہ وغیرہ لیکن اکثر عربی علما نے اس کو قبول کر لیا۔ بقول آرزو فارسی میں توافق موجود ہے۔ لیکن یہ صرف چند الفاظ ہی میں پایا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی یہ پایا جاتا ہے اس خاص لفظ کے مجازی معنی اور ایک لفظ کے دو معنی ہونے کی وجہ سے ضد کا باعث بن جاتا ہے جیسے لفظ سپوختن جس کے دو معنی ہیں زبردستی اندر لانا اور زبردستی اوپر اٹھانا، کسی چیز کو اوپر اٹھانے کے لیے اندر لانا ضروری ہے اسی طرح ہندی میں لفظ کل جس کے معنی روز گذشتہ اور روز آئندہ دونوں ہی ہیں۔

پینتیسویں اصل

یہ اصل مترادفات کے بارے میں ہے یہ پوری اصل مزہر پر مبنی ہے الفاظ مفردہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ایک چیز پر ایک اعتبار سے دلالت کرتے ہیں جیسے تیغ اور شمشیر۔ جیسا کہ ارباب لغت نے لکھا ہے، تیغ تیز[1] کا مبدل ہے۔

کیونکہ زای معجمہ غین سے بدل جاتا ہے یعنی تیز و تیغ و شمشیر مرکب ہیں شم بمعنی ناخن، و شیر، اور کبھی اور تیزی کی وجہ سے اس کو شمشیر کہتے ہیں

۱۔ ملاحظہ سر زبان ص ۲۲۲

اسی طرح آغوش و کنار و بر کو مترادف بنایا ہے. تحقیق کے مطابق آغوش گرفتن، بغل گرفتن ہے یعنی ہاتھوں کو کھولنا اور کسی کو کس کر پکڑ لینا اور سینے کے ساتھ چمٹا لینا اور در کنار گرفتن میں کسی کو اپنے زانوں پر بٹھانا اور خود سے لپٹا لینا۔ ان دونوں میں فرق صرف حالتوں کا ہے. پہلی حالت میں کھڑے ہونا ہے اور دوسری میں بیٹھا ہونا ہے۔ اگر کوئی کھڑا ہے اور اس نے کسی کو لپٹا لیا ہے اس کو "در آغوش گرفتن" کہیں گے "در کنار گرفتن" نہیں کہیں گے اسی طرح اگر کوئی بیٹھا ہے اور کسی کو اپنے پاس بٹھا لیا ہے اس کو "در کنار گرفتن" کہیں گے." در آغوش گرفتن" نہیں کہیں گے۔

اکثر لغت کی کتابوں میں یزدان ایزد کا مرادف معلوم ہوتا ہے کیونکہ یزدان مخفف ایزدان ہے جو کہ الف کے اضافے سے بنا ہے۔ اسی طرح لفظ ایمہ الف پر زبر کے ساتھ مرادف یاوہ یافہ ہے. خاقانی[1]:

ایمہ مگو کہ آسمان اہل برون نمی دہد   اہل چو[2] نامد از عدم چیست گناہ آسمان

چھتیسویں اصل:

یہ اصل علم اتباع سے متعلق ہے اور مزھر پر مبنی ہے۔ ابن فارس نے جو کچھ اپنی کتاب فقہ اللغۃ میں لکھا ہے اس میں اسی طرز کو اپنایا گیا ہے جیسا کہ مزہر میں بیان کیا گیا ہے. اس اصل میں ان معنی دار اور غیر معنی دار الفاظ کے بارے بیان کیا گیا ہے جنہوں نے فارسی اور دوسری زبانوں میں جگہ پائی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ اس کو آزادی

۱۔ جہانگیری ص ۲۱۷، سروری ص ۱۰۳ (۲) جہانگیری: کہ.

سے استعمال کرتے ہیں۔ آرزو کے مطابق غیر معنی دار الفاظ معنی دار الفاظ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں تاکہ جملے میں زور پیدا ہو سکے جیسے سلیب[1] و تیب بمعنی حیران و پریشان، داش[2] و دلوس بمعنی کمینہ اور ہیچ، ترت و برت[3] بمعنی زیر و زبر، تار[4] و مار بمعنی پریشان۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ یہ فارسی میں واو عطف کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جبکہ عربی میں بغیر واو عطف کے ہیں۔ لیکن جہانگری[5] کے مطابق شور و مور دو الگ الگ معنی کے لفظ ہیں، شور کے معنی نحس اور مور کے معنی مور چہ ہے اگر کسی کو حقارت سے متوجہ کرنا چاہیں تو شور و مور کہہ دیتے ہیں

خاقانی[6]:

شور و مور ند حسود[7] انش اگرچہ گہ لاف۔ شار و مار اند و نفر بالنفر آمیختہ اند

حکیم سنائی[9]:

زبہر دو طامات و تراز مزخرف ہمہ سال با خلق در شور و مور اند

شار و مار کو رشیدی و سروری کاشی نے بغیر واؤ کے بتایا ہے بمعنی مار بزرگ

۱۔ برہان ص ۱۲۰۱: "این لغت از اتباع است ہمچو تار و مار و خان و مان و امثال آن و بمعنی سرگشتہ و متحیر و مدہوش و حیران باشد و بمعنی سرگشتگی در شغل و کار نیز ہست"۔

۲۔ برہان ص ۸۱۴: این کلمہ از اتباع است ہمچون تار و مار ترت و مرت بمعنی ضائع و ابتر و دور انکندنی باشد مانند خار و خش و خماش و امثال آن و بمعنی سفیہ و سفلہ و دون ہم ہست (۳) برہان ص ۴۸۲: با تای قرشت بروزن ہرج و مرج، این لغت از اتباع است بمعنی تاخت و تاراج و زیر و زبر و پراگندہ و پریشان و بزیان رفتہ و نقصان آمدہ و از ہم افتادہ۔ (۴) برہان ص ۴۵۷: بروزن کار و بار۔ این لغت از اتباع است بمعنی پراگندہ از ہم پاشیدہ و زیر و زبر شدہ و بمعنی پریشان باشد و ناچیز و نابود گردیدہ را نیز گویند (۵) جہانگیری ص ۲۰۳۷ (۶) ایضاً (۷) متن: حسود انت (۸) جہانگیری و لیکن (۹) ایضاً ص ۲۰۳۷ (۱۰) رشیدی بمعنی ۹۱۰

اور شور و مور بھی بغیر واؤ کے مورچہ کے معنی میں بتایا ہے۔ آرزو نے
سراج اللغۃ میں لکھا ہے کہ شور و مور بغیر واو عطف کے بمعنی شوم
اور ضعیف ہے جیسا کہ شور بخت، شور چشم ۔

سینتیسویں اصل

یہ اصل اعراب سے متعلق ہے۔ بقول آرزو الفاظ کو بغیر حرکت کے
(اعراب) تلفظ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر آواز مخرج تک پہنچ جائے
یا اس سے آگے بڑھ جائے وہ حرکت ہے اور اگر تھوڑی حرکت ہو
اور اس میں زیادہ زور نہ ہو جس کی بنا پر وہ طویل محسوس ہو اس
کو سکون کہتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرکت ساکن
اور متحرک دونوں ہی ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر الفاظ کا تلفظ
محال ہے۔ ممکن ہے دو حروف کی ایک ہی حرکت* ہو مثلاً واو معدولہ
خواب وخواست۔ اس طرح کے ممکنات رخ کے بعد واو معدولہ کے
لیے ہی مخصوص نہیں ہیں، واو مذکورہ گذرے ہوئے حرف کے لہجہ سے
جوڑا جاتا ہے (دونوں میں ایک ہی اعراب پائی جاتی ہے) چاہے
حرف رخ نہ بھی ہو بلکہ کوئی دوسرا ہی حرف ہو مثلاً گوال (بمعنی گڈریار)
جس میں واو معدولہ سے پہلے فارسی کاف (گ) سے منسلک ہے
آرزو کے مطابق چاہے واو معدولہ حرف رخ سے جڑا ہوا ہو یا

---

۱ سراج اللغۃ ورق ۱۰۲: شور بوزن مور بحرف و بمعنی شوم ... شور بخت ...
وشوم نیز چنانچہ شور چشم و شور بخت و این اغلب کہ مجاز است و بمعنی ورزش کاری نیز ...
ماخوذ است و شور بمعنی ورزش کنندہ سلاح و بمعنی برہم زنندہ و آمیزندہ و اہم بدین دو
معنی و شور بندہ دار لشستن و شوریدن ہر دو معنی مصدر است و شور ظاہرا ماخوذ است
از معنی برہم زنندہ پس مجاز است۔

سی اور حرف سے دوسرے حروف کبھی لہجہ کے اعتبار سے ایک ہی اعراب کے ہوسکتے ہیں مثلاً گیان (بمعنی علم) جس میں حرف "ی" ہے نہ کہ واؤ لیکن یہاں گیان ہندی لفظ ہے جوکہ فارسی میں مستعمل نہیں ہے۔

اعراب تین طرح کے ہوتے ہیں کسرہ، ضمہ و فتحہ جنکو فارسی میں زیر پیش اور زبر کہتے ہیں۔ اگر زبر کے بعد الف ہوتا ہے تو مدہ ہوجاتا ہے، اگر زیر کے بعد "ی" ہوتا ہے اور پیش کے بعد واؤ ہوتا ہے تو اس کو یای معروف اور واؤ معروف کہتے ہیں۔ فارسی میں اس طرح بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ متاخرین میں سے اکثر اہل ایران واؤ اور یای مجہول کو معروف کہتے ہیں اور مطلقاً شیر بمعنی لبن، و شیر بمعنی اسد اور لوت بواؤ معروف بمعنی برہنہ اور بواؤ مجہول بمعنی اقسام طعام ہے۔

اڑتیسویں اصل

یہ اصل سب سے زیادہ طویل ہے اور سب سے اہم بھی۔ فارسی زبان کی بنیاد دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کی طرح چوبیس حرف پر ہے۔ آرزو کے قول کے مطابق زبان کی بنیاد ان ہی حروف پر ہوتی ہے۔ صاحب رشیدی کے مطابق یای موحدہ اور فا فارسی میں نہیں استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں اٹھائیس حروف ہوتے ہیں ان میں سے آٹھ حروف فارسی میں نہیں ہیں کیونکہ فارسی لہجہ کے ساتھ ان کا تلفظ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن فارسی میں کاف فارسی، بای فارسی جیم و زای عجمی زیادہ ہیں اس سے حروف کی کل تعداد چوبیس ہوجاتی ہے۔ شرف الدین علی یزدی نے آٹھ حروف کو جو فارسی میں نہیں ہیں اور

عربی کے حروف ہیں، اس طرح نظم کیا ہے

ہشت حرف است آنکہ اندر فارسی نایدہمی
تانیاموزی نباشی اندریں معنی معاف

بشنو ازمن تاکدام است آن حروف ویادگیر
ثا و حا و صاد و ضاد و طا و ظا و غین وقاف

آرزو نے ہر ہر حرف کو الگ الگ سلسلے وار بیان کیا ہے۔ ان میں قواعد کے اعتبار سے جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس میں مفرد الفاظ بیان کیے گئے ہیں۔

انتالیسویں اصل:

اس اصل میں آرزو نے فارسی میں استعمال ہونے والے غیر مفرد الفاظ سے بحث کی ہے۔ اور ان کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں ہر حرف کو الفبائی اعتبار سے سلسلے وار بیان کیا ہے اور ان سے متعلق جو فارسی زبان میں قواعد ہیں اس پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے وہ بتاتے ہیں کہ کبھی الفاظ میں بعض کلمات زیادہ کر دیتے ہیں۔ ایسا کبھی اسم کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے مثلاً آب و آو۔ آو، آب کا بدل ہے۔ لفظ پایاب اصل لفظ ہے پای بمعنی پایندگی و بقا و قوت و طاقت، فردوسی:

مرا نیست در جنگ پایاب او   نہ بینی برد ھای پر تاب او

مولف کا کہنا ہے کہ "پایاب در اصل بمعنی جای است در آب دریا کہ پا دو آنجا بہ آب رسد"

چالیسویں اصل:

یہ اصل "درمعرفت بحث فی المزھر" سے ماخوذ ہے۔ قال ابن فارس فی فقۃ اللغۃ العرب تحت من کلمتین کلمۃ واحدۃ وھو جنس من الاختصار کجعلہ"۔ آرزو کا کہنا ہے کہ یہ بحث فارسی میں کبھی آئی ہے۔ لیکن بہت کمی کے ساتھ جیساکہ اہل ایران سنتی ملحد کو سلحدسین مہملہ کے ساتھ کہتے ہیں۔ اسی طرح بسمل جوکہ بسم اللہ سے ماخوذ ہے جب جانور کو ذبح کرتے ہیں اس وقت بسم اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح بتیل بیت المال کے معنوں میں ہے اور عبدل عبداللہ ہے ایک شعر ہے:

متبذل معنی پوشیدہ وا ماندہ چند　　　مال خود ساختہ بایک دو سہ بیت بتیل

اکتالیسویں اصل

اس اصل میں روزمرہ اور محاورات و امثال سے بحث کی گئی ہے اور ان کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ آرزو کے قول کے مطابق وہ کلام جو امثال سے پُر ہو جلد ہی ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ غنی کاشمیری[۱] نے اس بات کو نہایت خوبصورت پیرایہ میں وضاحت کے ساتھ اپنے مندرجہ ذیل شعر میں استعمال کیا ہے:

چہ نسبت نغمہ را با روی نیکو

اور

شنیدہ کی بود مانند دیدہ

بلبل[۱] برداشت آشیا نرا　　　گل گفت کہ خس کم و جہاں پاک

امثال کے استعمال سے لطف سخن پیدا ہوجاتا ہے شیخ جلال الدین سیوطی

۱۔ دیوانِ غنی کشمیری ص ۱۸۳

مزھر میں کہتے ہیں :

"قال ابو عبیدہ الامثال حکمۃ العرب فی الجاہلیۃ والاسلام کانت تعارض کلامھا فیبلغ بھا ما حاولت من حاجاتھا فی المنطق بکنایۃ غیر تصریح فیجتمع لھا بذلک ثلاث احوال ایجاز اللفظ واصابۃ المعنی وحسن التشبیہ وقد ضربھا بہ النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم وتمثل بھا ھو ومن بعدہ من السلف وقال الفارابی فی دیوان الادب المثل ما تراضاہ العامۃ والخاصۃ فی لفظہ ومعناہ حتی ابتذلوہ فیما بینھم بہ فی السراء والضراء واستدروا من الدر ووصلوا بہ الی المطالب القصیۃ وتفرجوا بہ عن الکرب۔

وھو من ابلغ کلام الحکمۃ لان الناس لا یجتمعون علی ناقص او مقصر فی الجودۃ والنادرۃ حکمۃ صحیحۃ تؤدی ما یؤدی عنہ المثل الا انھا لم تشع فی الجمھور ولا یجر الا فی الخواص ولیس منھا بین المثل الا الشیوع"

مندرجہ ذیل کچھ مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں

۱۔ از کوزہ ہمان تراود کہ در وست۔

ہر کس سرانجام فطرت او درون خود را در جریان عمل بروز می دہد۔ از کوزہ آسمان افتادن بسیار متکبر و مغرور بودن[۱] پیالے سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔ یعنی جس چیز کی فطرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں[۲]

۲۔ آنچہ در دیگ است بکچہ بر می آید۔

۱۔ رک، فرہنگ عوام ص ۵۱۔ (۲) رک: فرہنگ امثال ص ۱۲۔

هرکس همان استعدادها و ذاتیاتی را که دارد در موقع عمل از خود بروز می دهد. همانند: از کوه همان برون تراود که در اوست[1]

جو کچھ دیگ میں ہے وہ چمچے میں آئے گا۔ یعنی اصلیت کہاں تک چھپے گی۔ آخر ظاہر ہوکر رہے گی[2]

۳۔ اول طعام بعده کلام :

این مثل را وقتی بکار برند که موقع صرف شام یا نهار باشد و کس بخواهد باب گفتگوئی را بگشاید در این صورت به وی گویند یعنی اول غذائی خود مان را بخوریم و سپس با فراغ بال بصحبت و گفتگو بپردازیم[3]

پہلے کھانا پیچھے باتیں۔ بھوک کی حالت میں لوگ یہ نقرہ کہتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے کھانا کھالیں اس کے بعد باتیں کریں گے[4]

۴۔ بالاتر از سیاهی رنگ دگر نباشد :

بالای سیاهی رنگی نیست، بدتر از آن چیزی نیست. مثال : بآن همه نسبت های ناروائی که بمن دادند۔ این نسبت هم روی آن[5]

سیاہی سے بہتر کوئی اور رنگ نہیں[6]

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۲۶ (۲) فرہنگ امثال ص ۲۸
(۳) فرہنگ عوام ص ۶۹ (۴) فرہنگ امثال ص ۳۴
(۵) فرہنگ عوام ص ۸۶ (۶) فرہنگ امثال ص ۳۴

(۵) پس ماندہ گاؤ نجر باید داد :

مرد شریف و بزرگوار ہرگز زیر جا ریزہ خواری خوان دونان نرود[1]

بیل کا جھوٹا گدھے کو دینا چاہیے۔ یعنی جس چیز پر کوئی ذلیل آدمی تصرف کر چکا ہو وہ اسی قابل ہے کہ اس سے زیادہ ذلیل آدمی کو دی جائے[2]

(۶) پشہ چو پُر شد بزند پیل را ،

عوام می گویند پشہ کہ زیاد شد فیل را می زند ہمانند: آری باتفاق جہان می توان گرفت[3]۔

جب بہت سے مچھر جمع ہو جاتے ہیں تو ہاتھی کو گرا دیتے ہیں یعنی جب بہت سے کمزور آدمی متفق ہو جاتے ہیں تو بڑے سے بڑے شہ زور پر غالب آ جاتے ہیں[4]۔

۷۔ تا تریاق از عراق آرند مار گزیدہ مردہ بود :

ہمانند و یعنی نوشدار و بعد از مرگ سہراب[5]۔

جب تک عراق سے تریاق لایا جائے، سانپ کا کھاٹا مر جائے گا۔ جب کسی امر کے لیے کسی فوری تدبیر کی ضرورت ہو اور کوئی شخص ایسی تدبیر بتائے جس میں بہت دیر لگے تو یہ قول نقل کرتے ہیں[6]۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۳۶

(۲) فرہنگ امثال ص ۱۸

(۳) فرہنگ عوام ص ۱۴۰

(۴) فرہنگ امثال ص ۵۹

(۵) فرہنگ عوام ص ۱۵۳

(۶) فرہنگ امثال ص ۶۲

۸- تاشب نروی روی روز نجای نرسی :

همانند : از تو حرکت از خدا برکت، هر که کوشید برد۔[1]

اگر رات کو نہ چلو گے تو دن کو کہیں نہ پہنچو گے. یعنی بغیر محنت کیے ہوئے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔[2]

۹- جهان دیده بسیار گوید دروغ :

این مثل شاید در دنیای قدیم صدق می کرد ولی در دنیای امروز که سیر و تفریح در اقطار آن با کمال سهولت انجام می گیرد کمتر مصداق پیدا می کند[3]

جہان دیدہ آدمی بہت جھوٹ بولتا ہے ۔

۱۰- جای بنشین که برنخیزانندت :[4]

همانند : پا را از گلیم خود درازتر مکن ۔[5]

ایسی جگہ بیٹھو کہ اٹھنا نہ پڑے ۔ یعنی جب کسی محفل میں جاؤ تو اس جگہ بیٹھو جو تمہاری حیثیت کے موافق ہو، ایسا نہ ہو کہ تم اپنے سے بڑے مرتبہ والوں کی جگہ بیٹھ جاؤ اور پھر وہاں سے اٹھائے جاؤ[6]

۱۱- چشم بد دور :

بعنوان دعا و تعویذ و در موقع تمجید و تحسین از چیزی یا از صفات خوب اشخاص و مخصوصاً اطفال گفته می شود۔ مثال چشم بد دور

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۲۱۵

(۲) فرہنگ امثال ص ۶۱ (۳) فرہنگ عوام ص ۱۹۶

(۴) فرہنگ امثال ص ۲ (۵) فرہنگ عوام ص

(۶) فرہنگ امثال ص ۶۹-۷۰

فرزندان برادرم بچه های خیلی آب در آمده اند. شاعری گوید:

چشم بد دور محفلی دیدم روشن از نور حق نه از نیراق[1]

بری نظر دور رہے یعنی نظر نہ لگے. کسی کی تعریف کرتے وقت یہ فقرہ استعمال کرتے ہیں[2]۔

۱۲. چاه کن همیشه در چاه است:

کسی که بدیگری بدی یا ظلمی بکند خودش هم بدی یا ستم خواهد دید. کسیکه برای دیگری سعایت کند سرانجام خود دستخوش عواقب شوم آن خواهد رسید[3]۔

کنواں کھودنے والے کے آگے کنواں پڑتا ہے، یعنی جو دوسروں کو بلا میں پھنساتا ہے اکثر وہ خود بلا میں پھنس جاتا ہے[4]۔

۱۳. حاجت مشاطه نیست روی دلآرام را:

روی نیکو محتاج زینت و زیور نیست، کسی متصف بصفات نیکو و خصال پسندیده است نیاز مند آراستگی های صورت نیست. همانند:

تن آدمی شریف است بجان آدمیت

نه همین لباس زیباست نشان آدمیت[5]

اچھی صورت کے لیے مشاطہ کی ضرورت نہیں ہے یعنی جو چیز حقیقت میں اچھی ہے وہ بغیر ظاہری آرائش کے اچھی معلوم ہوتی ہے[6]۔

۱۴. حلوا حلوا گفتن دهن شیرین نمی کند:

تا نعمتی بکف نیاید از وجود آن نمی توان بهره مند شد[7]۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۱۹۴ (۲) فرہنگ امثال ص ۴۷

(۳) فرہنگ عوام ص ۱۹۰ (۴) فرہنگ امثال ص ۷۲ (۵) فرہنگ عوام ص ۲۰۶

(۶) فرہنگ امثال ص ۸۱. (۷) فرہنگ عوام ص ۲۱۴۔

حلوا حلوا کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہوتا ہے۔ یعنی کسی چیز کا صرف ذکر کرنے سے اس چیز کا لطف حاصل نہیں ہوتا[۱]

۱۵۔ خانۂ درویش را شمع بہ از مہتاب نیست:

وقتی انسان دسترسی بچیز بہا دارد و جالبی ندارد رفع احتیاج و نیازمندی خویشتن را بچیز سادہ تری کہ جای آنرا تواند گرفت قناعت می کند۔[۲]

فقیر کے گھر کے لیے چاندنی سے بہتر کوئی شمع نہیں[۳]

۱۶۔ خانۂ شیشہ را سنگی بس است:

در جہان دو دیوانہ را دنگی بس است: ہمانند و بمعنی یکی دیگر بر نی بیح دارم[۴]۔

شیشے کے مکان کے لیے ایک پتھر کافی ہے یعنی بودی اور کمزور چیز بہت آسانی سے ٹوٹ جاتی ہے[۵]۔

۱۷۔ دست بکار و دل بیار:

ہر چند سرگرم کار است، ولی دلش در جای دیگر یا پیش یار است[۶]

ہاتھ کام میں اور دل دوسری طرف ہیں۔ یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص ہاتھ سے کام کر رہا ہو مگر اس کی طرف متوجہ نہ ہو دل [illegible] کچھ اور سوچ رہا ہو۔[۷]

---

(۱) فرہنگ امثال ص ۸۳ (۲) فرہنگ عوام ص ۲۲۰

(۳) فرہنگ امثال ص ۸۷ (۴) فرہنگ عوام ص ۲۲۰

(۵) فرہنگ امثال ص ۸۷ (۶) فرہنگ عوام ۲۶۸

(۷) فرہنگ امثال ص [illegible]

۱۸۔ دست شکستہ وبال گردن است :
عضو بیکار و بیفایدہ خانوادہ یا فرزند بد و فاسد۔ تحمل بر خانوادہ است ولی از نگاهداری وی هم گزیری نیست۔[1]

ٹوٹا ہوا ہاتھ گردن کے لئے وبال ہے یعنی جب تک کسی چیز سے ہمارا کام نکلتا رہتا ہے اسی وقت تک ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور وہ چیز ہم کو پیاری ہوتی ہے مگر جب وہ ہمارے کام کی نہیں رہتی اس کو اپنے پاس رکھنا بھی ہمیں گراں گزرتا ہے[2]

۱۹ ۔ روز نو روزی نو : از آیندہ اندیشہ مکن، ہر روز نو کہ بیاید روزی آن نیز ہمراہ بیاید (۱) در دنیای امروز این یک دستور غلطی است دبہمین جہت برای تامین آیندہ اشخاص انواع بیمہ ہا و صندوقہای پس انداز ترتیب دادہ اند تا پس از این کسی بمثل روز از نو، روزی از نو تمسک نجوید این مثل بمعنی ہر چیز کہ عوض دارد گلہ ندارد" نیز بکار می رود مراد این است کہ اگر خدمتی خواستی انجام ندادم اینک برای انجام ہمان خدمت یا خدمت دیگر آمادہ ام بیا اگر فلان کار را در موقع خود نکردی ہنوز موقع نگذشتہ

۱۔ فرہنگ عوام ص ۲۷۳
۲۔ فرہنگ امثال ص ۵

است ہم اکنون می توانی بکنی۔"(۱)

نیا دن نئی روزی ۔ یعنی کل کے لیے آج سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں. آج جو کچھ ملا ہے اسے اطمینان اور بے فکری سے صرف کرو کل کی بات کل کے ساتھ ہے جس خدا نے آج دیا ہے وہی کل بھی دے گا. اس قول کے مصداق وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی روزی حاصل کرنے کا طریقہ روز روز بدلا کرتے ہیں(۲)

۲۰۔ رنگریز بریش خود درمانده :۔ یعنی رنگ ریز از ریش خود عاجز است چراکہ او ہمہ چیز ہارا رنگ می کند اما ریش خود رانگ نتوان کرد. مراد از این است کہ در ہمہ کارہای دیگران مدد می کند و وقتیکہ احتیاج برای خود آید مدد خود نتوان کرد۔

رنگ ریز اپنی داڑھی سے عاجز ہے۔ یعنی وہ اور سب چیزیں تو رنگ دیتا ہے مگر اپنی داڑھی نہیں رنگ سکتا. مراد یہ ہے کہ دوسروں کے بگڑے ہوئے کام بنانا آسان ہے مگر جب خود کسی پر کوئی مصیبت آجاتی ہے تو کچھ بنائے نہیں بنتی ہے(۳)

۲۱۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز : یا زمانہ سازی کردن با تملق و چاپلوسی و زبان بازی با مردمان رفتار کردن ۔ مثال : فلاں با ہیچکس راست نمی گوید و با ہمہ زمانہ سازی می کند(۴)

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۴۱۲

(۲) فرہنگ امثال ص ۱۱۵

(۳) فرہنگ امثال ص ۱۱۴

(۴) فرہنگ عوام ص ۳۲۷

زمانہ تجھ سے موافقت نہ کرے گا تو زمانے سے موافقت کر یعنی تم یہ فضول کوشش نہ کرو کہ دنیا تمہاری ہم خیال ہو جائے۔ بلکہ تم کو خود اس رستہ پہ چلنا چاہیئے جس پر دنیا چل رہی ہے[1]۔

۲۲- زمین سخت و آسمان دور: دسترس بچیزی نداشتن۔ از ہر چارہ و درمانی بی بہرہ بودن۔ ہمانند: دست ما کوتاہ و خرما نخیل[2]۔

زمین سخت ہے اور آسمان دور ہے یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شخص کے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہ ہو۔ یعنی اگر زمین سخت نہ ہوتی تو وہ اس میں سما جاتا اور اگر آسمان دور نہ ہوتا تو وہ وہیں جا کر پناہ لیتا[3]۔

۲۳- سگ زرد برادر شغال: ہر دو از حیث بدی و ناشائستگی یکسان اند۔ ہمانند: نہ قم خوب است نہ کاشان، لعنت بہر دو تا شان سگ سیاہ و سفید ندارد[4]

زرد کتا گیدڑ کا بھائی۔ جب کسی برے آدمی کا ذکر کر کے کسی دوسرے آدمی کا نام لیتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی قریب قریب اتنا ہی برا ہے تو یہ فقرہ بولتے ہیں[5]

۲۴- سلام روستائی بے طمع نیست: یعنی سلام و تعارفہا یا اظہار خصوصیت ہا مقدمہ ای برای بیان خواہش و تمنائی است[6]

(۱) فرہنگ امثال ص ۱۱۸ (۲) فرہنگ عوام ص ۳۲۸
(۳) فرہنگ امثال ص ۱۱۸ (۴) فرہنگ عوام ص ۳۵۸
(۵) فرہنگ امثال ص ۱۲۳ (۶) فرہنگ عوام ۳۶۰

دہقانی کا سلام بے غرض نہیں ہوتا جب کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو سلام کرتا ہے اور خاموش کھڑا ہو جاتا ہے مگر اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے تو یہ جملہ کہتے ہیں۔[1]

۲۵۔ شیشہ شکستہ را پیوند کردن مشکل است : ہمانند : کاسہای کہ بشکست کلوا پذیر نیست[2]

ٹوٹے ہوئے شیشے کو جوڑنا مشکل ہے یعنی جب کسی طرف سے دل میں میل آجاتا ہے تو پھر صفائی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔[3]

۲۶۔ شنیدہ کی بود مانند دیدہ ترا دیدیم و یوسف را شنیدیم[4]

ہمانند : شنیدن چون دیدن نباشد درست۔[5]

سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی چیز کی طرح کہاں ہوتی ہے[6]

۲۷۔ صد کلاغ و یک کلوخ ، ہمانند : صد موش رایک گربہ بس است

سو کوؤں کے لیے ایک ڈھیلا کافی ہے۔ یعنی بزدلوں کی کثرت سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ ایک ذراسی سختی میں سب تتربتر ہو جاتے ہیں۔[7]

۲۸۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیرین دارد : صبر کردن اگرچہ خیلی مشکل است اما اگر کسی می کند ثمر آن خوب می باشد[8]

صبر کڑا ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ یعنی صبر کرنا مشکل کام ہے مگر صبر کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے[9]

---

(۱) فرہنگ امثال ص ۱۲۴ (۲) فرہنگ عوام ص ۳۸۸

(۳) فرہنگ امثال ص ۱۲۸ (۴) فرہنگ عوام ص ۳۸۵

(۵) ایضاً ص ۱۲۷ (۶) ایضاً ص ۳۹۲

(۷) ایضاً ص ... (۸) ایضاً ص ۳۹۰

۲۹۔ ضامن دست بخیه است: موقعی که ضمانت دیگری را کردی باید قبلاً درفکر پرداخت مال الضمان باشی، چه ممکن است ضامن شده از پرداخت دین خویش در سر موعد دریغ دارد[1]

۳۰۔ طوق لعنت بگردنش افتاد: زحمت یا مشقتی بر عهدهٔ کسی واگذار شدن۔ در مزاوجت گرفتار زن بدخوی و بدرفتار شدن: مثال نمی دانم این کار چه طوق لعنتی بود که بگردن من گذاردند نمی دانم این زن چه طوق لعنتی بود که بر گردن من نهادند[2]۔

لعنت کا طوق اس کی گردن میں ڈال دینا[3]۔

۳۱۔ طشتش از بام افتاد: همانند به معنی رسوا شدن و بهمان طور که وقتی طاس که ظرفی است از سر بام بیفتد صدای درشت می کند، وقتی از عمل زشت و ننگینی هم پرده برداشته شود۔ صدای آن همه جا می پیچید[4])

طشت کو ٹھے پر گر پڑا۔ یعنی بدنامی ہوئی اور بہت ہوئی[5]

۳۲۔ ظاهر و باطنش یکی است: یک رو و یک رنگ و بی رو و ریا بودن[6]۔

ظاہر و باطن یکساں ہونا۔ صاف دل ہونا۔

۳۳۔ ظرفش لبریز است، عمرش سر آمده، همانند: آفتابش لب بام رسیده۔ طاقتش طاق گردیده[7]۔

عمر کا آخری وقت پر پہنچ جانا۔ قریب المرگ ہونا۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۳۹۵۔ (۲) فرہنگ عوام ص ۴۰۰ (۳) فرہنگ امثال ص ۱۳۱
(۴) فرہنگ عوام ص ۳۹۸ (۵) فرہنگ امثال ص ۱۳۱ (۶) فرہنگ عوام ص ۴۰۱
(۷) فرہنگ امثال ص ۴۰۱

۳۴۔ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود، ہرکس در پیروی از دین و عقیدۂ خود آزاد است[1]۔

عیسیٰ اپنے دین پر اور موسیٰ اپنے دین پر یعنی ہر شخص کے خیالات جدا ہوتے ہیں۔ اختلاف رائے پر جھگڑا نہ ہونا چاہیئے[2]۔

۳۵۔ علاج واقعہ پیش از وقوع باید کرد .... بلا ندیدہ د عارا شروع باید کرد ۔ ہمانند: سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل، چون پُر شد نشاید گزشتن بہ پیل، گربہ را سر حجلہ می کشند، دارو پس مرگ کی کند سود[3]۔

واقعے کا علاج اس کے واقع ہونے سے پہلے کرنا چاہیئے۔ یعنی اگر کسی ناگوار واقعے کے پیش آنے کا اندیشہ ہو تو اس کی روک تھام پہلے سے کرنا چاہیئے[4]۔

۳۶۔ غور رسو نیز نمی شود: ہمہ کس نمی تواند جای ہمہ کس را بگیرد ہمانند: ہمہ گردی گردو نیست[5]

۳۷۔ غریب کور می باشد: چراکہ باکسی آشنای و با وضاع و احوال دیاری کہ در آنجا وارد شدہ معرفتی ندارد[6]

۳۸۔ فردا راکہ دیدہ است: معلوم نیست فردا چہ پیش آمدی خواہد شد[7]۔

کل کس نے دیکھی ہے۔ یعنی آنے والے زمانے کا کیا اعتبار۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۱۲/۳ (۲) فرہنگ امثال ص ۱۳۷

(۳) فرہنگ عوام ص ۲/۰۸ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۳۵

(۵) فرہنگ عوام ص ۱۵/۳ (۶) فرہنگ عوام ۱۴/۳ (۷) فرہنگ عوام ص ۱۸/۲

۳۹۔ فریاد سگان کم نکند رزق گدارا: تہمت ہا و درو غہا و افترا ہای بد گو یان ہرگز مانع پیشرفت کار یا ترقی و تعالی مردمان زحمت کش نمی شود[1]

کتوں کا بھونکنا فقیر کے رزق کو کم نہیں کردیتا ہے یعنی اپنے کام میں لگے رہو اور لوگوں کو بکنے دو۔ ان کے کہنے سننے کا اثر تمہاری کامیابی پر نہیں پڑ سکتا[2]۔

۴۰۔ قہر درویش بزبان درویش: قہر و تعرض کردن مردم نیاز مند غالباً بزبان خود شان تمام می شود[3]

فقیر کا غصہ فقیر کی جان پر۔ یعنی غریب بے بس آدمی کسی اور کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا اپنے غصہ میں آپ ہی جلتا ہے[4]۔

۴۱۔ قطرہ قطرہ جمع گردد وانگہی دریا شود: ہمانند: ذرہ ذرہ لیتیم قالی می شود[5]

قطرہ قطرہ جمع ہو جاتا ہے تو دریا ہو جاتا ہے یعنی تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے[6]۔

۴۲۔ کم خرج و بالا نشین: خسیس کم خرج کن و پُر افادہ۔ ہر چیز کم قیمت پُر فائدہ[7]

قیمت کم وقعت زیادہ۔ یعنی ایسی چیز جو اچھی بھی ہو اور کم قیمت بھی ہو[8]۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۱۴۴ (۲) فرہنگ امثال ص ۱۲۹

(۳) فرہنگ عوام ص ۴۲۵ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۴۴

(۵) فرہنگ عوام ص ۴۳۲ (۶) فرہنگ امثال ص ۱۴۳

(۷) فرہنگ عوام ص ۴۶۵ (۸) فرہنگ امثال ص ۱۴۹

۴۳۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ است: جواب ہست ای برادر این نہ جنگ است۔ ہمانند۔ ہر دستی کہ دہی ہمان دست پس گیری، این جہان کوہ است وفعل ماندا، این ندارا بازمی گردد صدا[1]۔
ڈھیلا مارنے والے کی سزا پتھر ہے۔ یعنی جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا[2]

۴۴۔ گرگ آشتی کرد، صلحی بہ نفاق، فرخی گوید:

غم دیدم از آنکس کہ مرامی باید ببریدم ازاد تا دل من بگشاید
نادیدن او ہمی مرا بگزاید گرگ آشتی کنیم تا چون آید[3]

بھیڑیے کی دوستی، یعنی ایسی دوستی جس کا مقصد فریب دینا ہو[4]

۴۵۔ گر نبودی چوب تر فرمان نبردی گاو خر: ہمانند و بمعنی: فرمان کی برد گاو خر، تا ترس از مجازات نباشد مردم بدکار براہ راست نروند و مردم تنبل انجام وظیفہ نکنند[5]

اگر گیلی لکڑی نہ ہوتی تو بیل اور گدھے حکم نہ بجالاتے یعنی جب تک کسی طرح کا خوف نہ ہو کوئی کسی کی اطاعت نہیں کرتا[6]۔

۴۶۔ لایق افسر نباشد ہر خری: لایق ہر خر نباشد زعفران یا لایق ہر سر نباشد افسری ہمین معنی دارد یعنی این چیز درخور او نیست[7]
ہر سر تاج کے قابل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوتا کہ اس کو بڑے سے بڑا مرتبہ دیا جائے[8]۔

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۴۶۲ (۲) فرہنگ امثال ص ۱۴۹
(۳) فرہنگ امثال الحکم ص ۱۲۹۹ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۵۵
(۵) فرہنگ عوام ص ۴۸۹ (۶) فرہنگ امثال ص ۱۵۶
(۷) فرہنگ عوام ص ۵۰۸ (۸) فرہنگ امثال ص ۱۵۸

۴۷ - لیلیٰ را بچشم مجنون باید دید[1]:

لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیئے۔ یعنی کسی چیز کی خوبی اس کے قدردان کے دل سے پوچھو۔[2]

۴۸ - مار گزیدہ از ریسمان می ترسد، انسان از ہر کس یا از ہر چیز آزار و آسیب دید، ہمیشہ از او یا انواع آن ہراس دارد۔[3]

سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے۔[4]

۴۹ - مردہ آنست کہ نامش بہ نیکوئی نبرند: سعدی گوید:

سعدیا مردِ نکونام نمیرد ہرگز ‏ ‏ ‏ ‏ مردہ آنست کہ نامش بہ نیکوئی نبرند[5]

مردہ وہ ہے جس کا نام نیکی کے ساتھ نہ لیں۔ یعنی اگر کسی کے مرنے کے بعد کوئی اس کا نام نہ لے یا برائی کے ساتھ لے وہ بیشک مردہ ہے۔ ورنہ جب تک کسی کا نام زندہ ہے تب تک اس کو زندہ سمجھنا چاہیئے۔[6]

۵۰ - نورٌ علیٰ نور: ولو تمسسہ نار ... یھدی اللہ لنورہ من یشاء[7] - ابو الفرج رونی گوید:

ہمی تابد ز نور روی رایت ‏ ‏ ‏ ‏ جہانِ ملک را نورٌ علیٰ نور[8]

---

(۱) فرہنگ عوام ص ۵۱۷ (۲) فرہنگ امثال ص ۱۶۰

(۳) فرہنگ عوام ص ۵۲۱ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۶۱

(۵) فرہنگ عوام ص ۵۶۱ امثال الحکم ص ۱۵۲۳ (۶) فرہنگ امثال ص ۱۶۶

(۷) قرآن کریم سورہ ۲۴ آیۃ ۳۵

(۸) فرہنگ عوام ص ۶۱۳، امثال الحکم ص ۱۸۳۹

نور پر نور۔ اس فقرے سے مراد ہوتی ہے کہ فلاں بات تو اچھی تھی یہ اور بھی اچھی ہو گئی۔ یہ فقرہ طنز کے موقع پر بھی بولتے ہیں سونے پر سہاگہ ہوا۔[1]

۵۱۔ نمک می خورد و نمکدان می شکند: ناسپاسی کردن۔ محبت را بعداوت و نیکی را بہ بدی سزا دادن۔ مثال[2]

صد قش نبین و مہر نبیندارش   نان بشکند ہمی و نمکدان را
در محفل رندان جہان سگ بہ ازاوست   ہر کس کہ نمک خورد و نمکدان شکند

(ناصر خسرو)[3]

نمک کھانا اور نمکدان توڑنا یعنی جس سے فائدہ اٹھانا اسی کو نقصان پہنچانا۔ جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا۔[4]

۵۲۔ ولی را ولی می شناسد: ولی کو ولی پہچانتا ہے یعنی ہر شخص اپنے سے آدمی کو خوب پہچانتا ہے۔[5]

۵۳۔ وقت ضرورت چو نماند گریز   دست بگیرد سر شمشیر تیز[6]

ضرورت کے وقت جب بھاگ بھی نہیں سکتے تو ہاتھ تیز تلوار کا قبضہ پکڑ لیتا ہے۔ یعنی جب آدمی مجبور ہو جاتا ہے تو مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔[7]

۵۴۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست: "این مثل چہ در امور مادی، مانند ہدیہ ای کہ از دوستی برسد یا مطالبہ شود و چہ در امور

---

(۱) فرہنگ امثال ص ۱۷۸   (۲) فرہنگ عوام ص ۶۱۲
(۳) امثال الحکم ص ۱۸۳۵   (۴) فرہنگ امثال ص ۱۷۷
(۵) ایضاً ص ۱۸۳   (۶) فرہنگ عوام ص ۶۳۰

معنوی، مانند ضرور یاتی کہ از طرف دوستی بدوستِ خود وارد آید یا عمل خلافی کہ از ناحیۂ رفیق شفیقی سہواً سرزند، ایراد می شود"[1]

"دوست سے جو ملے اچھا ہے"[2]

۵۵۔ ہرچہ در دیگ است بہ چمچہ بر می آید: "ہمانند و بعض از کوزہ برون ہمان تراود کہ در اوست"[3]

جو کچھ دیگ میں ہے وہ چمچے میں آجاتا ہے۔ یعنی جو اصلیت ہو ہے وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے[4]

۵۶۔ یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم:

آب در کوزہ و ما تشنہ لباں می گردیم　　یار در خانہ و ما گرد جہاں می گردیم

این بیت را کنایۃً تماماً و کاہی ہر یک از دو مصرع آنرا در موقعی ایراد کنند کہ در طلب چیزی باشند و در راہِ تحصیل آن سخت کوشش کنند و حال آنکہ آن چیز در اختیار یا در دسترس ایشان است براثر غفلت آنرا فراموش کردہ و ناگہان بیادش افتادہ اند"[5]

"دوست گھر میں اور میں دنیا بھر میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جب کوئی چیز کسی کے پاس موجود ہو اور وہ اس کی تلاش کرتا پھرے تو یہ مصرع پڑھتے ہیں:" بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈھورا"[6]

۵۷۔ یک سنگ و دو کلاغ: یک سنگ و چہل کلاغ، یک چوب و صد چہل چراغ ہست[7]

---

(۱) فرہنگ عوام ضمیمہ ص ۶۳۳　(۲) فرہنگ امثال ص ۱۸۵

(۳) فرہنگ عوام ص ۶۳۳　(۴) فرہنگ امثال ص ۱۸۵

(۵) فرہنگ عوام ص ۶۲۷　(۶) فرہنگ امثال ص ۱۹۵

(۷) فرہنگ عوام ۶۸۴

نور پر نور۔ اس فقرے سے مراد ہوتی ہے کہ فلاں بات تو اچھی
تھی یہ اور بھی اچھی ہو گئی۔ یہ فقرہ طنز کے موقع پر بھی بولتے ہیں
سونے پر سہاگہ ہوا۔[1]

۵۱۔ نمک می خورد و نمکدان می کشد: ناسپاسی کردن۔ محبت را بعداوت
ونیکی را به بدی سزا دادن۔ مثال[2]

نان بشکند ہمی و نمکدان را — صد قش نبین و مہر نبیندارش
ہر کس کہ نمک خورد و نمکدان شکند — در محفل رندان جہان سگ بہ ازاوست
(ناصر خسرو)[3]

نمک کھانا اور نمکدان توڑنا یعنی جس سے فائدہ اٹھانا اسی کو نقصان
پہنچانا۔ جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا[4]

۵۲۔ ولی را ولی می شناسد: ولی کو ولی پہچانتا ہے یعنی ہر شخص اپنے
سے آدمی کو خوب پہچانتا ہے[5]۔

۵۳۔ وقت ضرورت چو نماند گریز — دست بگیرد سر شمشیر تیز[6]
ضرورت کے وقت جب بھاگ بھی نہیں سکتے تو ہاتھ تیز تلوار کا قبضہ
پکڑ لیتا ہے۔ یعنی جب آدمی مجبور ہو جاتا ہے تو مارنے مرنے پر
آمادہ ہو جاتا ہے۔[7]

۵۴۔ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست: "این مثل چه در امور
مادی مانند ہدیہ ای کہ از دوستی برسد یا مطالبہ شود وچه در امور

(۱) فرہنگ امثال ص ۱۷۸ (۲) فرہنگ عوام ص ۶۱۲
(۳) امثال الحکم ص ۱۸۳۵ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۷۸
(۵) ایضاً ص ۱۸۳ (۶) فرہنگ عوام ص ۴۳۰
(۷) فرہنگ امثال ص ۱۸۳۔

معنوی، مانند ضروریاتی کہ از طرف دوستی بدوستِ خود وارد آید،
یا عمل خلافی کہ از ناحیۂ رفیق شفیقی سہواً سرزند، ایراد می شود"[۱]
" دوست سے جو ملے اچھا ہے[۲]"۔

۵۵۔ ہرچہ در دیگ است بہ چمچہ بر می آید: "ہمانند و یعنی:
از کوزہ برون ہمان تراود کہ دراوست[۳]"
جو کچھ دیگ میں ہے وہ چمچے میں آجاتا ہے۔ یعنی جو صلیت ہوتی
ہے وہ ظاہر ہوکر رہتی ہے[۴]

۵۶۔ یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم:

آب در کوزہ و ما تشنہ لبان می گردیم ‏ ‏ ‏ یار در خانہ و ما گرد جہاں می گردیم

این بیت را کاہی تماماً و کاہی ہریک از دو مصرع آنرا در موقعی
ایراد کنند کہ در طلب چیزی باشند و در راہِ تحصیل آن سخت کوشش
کنند و حال آنکہ آن چیز در اختیار یا در دسترس ایشان است
بر اثر غفلت آنرا فراموش کردہ و ناگہان بیادش افتادہ اند[۵]"
" دوست گھر میں اور میں دنیا بھر میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ جب کوئی
چیز کسی کے پاس موجود ہو اور وہ اس کی تلاش کرتا پھرے تو
یہ مصرع پڑھتے ہیں: " بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈھورا"[۶]

۵۷۔ یک سنگ و دو کلاغ: یک سنگ و چہل کلاغ، یک چوب
و صد چہل چراغ ہست[۷]

---

(۱) فرہنگ عوام ضمیمہ ص ۶۳۳ ۵۵ ‏ ‏ (۲) فرہنگ امثال ص ۱۸۵
(۳) فرہنگ عوام ص ۶۳۳ ‏ ‏ (۴) فرہنگ امثال ص ۱۸۵
(۵) فرہنگ عوام ص ۶۷۲ ‏ ‏ (۶) فرہنگ امثال ص ۱۹۵
(۷) فرہنگ عوام ص ۶۸۲

ایک پتھر اور دو کوے۔ جب ایک تدبیر سے دو مقصد حاصل ہو جائیں تو یہ قول نقل کرتے ہیں۔ اردو کی ایک مثل ہے " ایک پنتھ دو کاج "[1]

۵۸ - یار غار است ۔

اشارہ بدوستی و مصاحبت ابوبکر با حضرت رسول ؐ است کہ در مواقع فرار از مکہ بمدینہ در غاری پنہان شدہ و در آنجا سہ شبانہ روز خود را از نظر کفار قریش مخفی نگاہ داشتند تا پس از آن توانستند با فراغ بال بسفر خود بسوی مدینہ ادامہ دہند۔ مثال: فلان و فلان یار غار اند۔ مگر او یار غار تو بود کہ تمامی اسرار را نزد او فاش کردی۔ ہمانند ا

دو دوست جان در یک "قالب"[2]

---

(۱) فرہنگ امثال ص ۱۹۷۔

(۲)۔ فرہنگ عوام ص ۶۷۴

مثمر پر ایک تنقیدی نظر

مثمر میں فارسی زبان کا لسانی اور لغوی اعتبار سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس میں فارسی قواعد پر بھی آرزو نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ خان آرزو پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی میں اس نوعیت کا اہم کام کیا ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسا ماخذ نہ تھا جس کی مدد سے وہ لسانی، لغوی مسائل کو جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں حل کر سکتے۔ یہ امام سیوطی کی مزھر پر مبنی ہے جو عربی لغات سے متعلق ہے۔ ذیل میں مثمر کی علمی و ادبی اہمیت، خصائص اور بعض فرد گذاشتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ مثمر جلال الدین سیوطی کی مزھر پر مبنی ہے جو اصول سیوطی نے عربی زبان کے سلسلے میں اپنائے تھے

وہی آرزو نے فارسی زبان کے سلسلے میں اپنائے ہیں۔ فارسی زبان آریائی زبان ہونے کی بنا پر عربی زبان سے قطعی الگ ہے خان آرزو نے بہت سے ایسے عنوانات جو فارسی میں زیادہ اہم ہیں۔ اس میں شامل کیے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف فارسی اور عربی کے ہم رشتہ زبان ہونے اور دوسری طرف فارسی اور ہندی کے ایک ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے۔ مزھر اور مثمر کے تقابلی مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ آرزو نے سیوطی کے اصول اپنائے، لیکن وہ خود ایک اعلیٰ پایہ کے عالم تھے اور اس مطالعے میں ان کی انفرادیت آشکار ہے۔ مثمر اس کے مولف کی انتھک محنت کا ثمرہ ہے آرزو نے تقریباً

ان تمام تصانیف کو جو اس عنوان کے تحت دستیاب تھیں، جمع کیا ان کا بغور مطالعہ کیا اور تقریباً تمام مشہور شعرا اور ادبا، کی تصانیف سے اپنے مطالعے میں مدد لی۔

مثمر میں سنسکرت اور فارسی کے ہم رشتہ زبان ہونے سے بحث کی گئی ہے، فارسی اور سنسکرت الفاظ میں حرکات اور لہجہ کی یکسانیت کی وجہ سے انہوں نے دونوں زبانوں کو ہم رشتہ زبان بتایا ہے انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ہندی لفظ بستر اور فارسی بستر میں یکسانیت ہے۔ بستر (جو کہ زبر سے پڑھا جاتا ہے) اور بستر (جو کہ زیر سے ہے) میں بہت حد تک مناسبت ہے جب ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ اس طرح کے نظریات ایک ایسے عالم کے ہیں جو اسلام سے قبل ایران کی زبان سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتا تھا اور اسے سنسکرت اور دوسری زبانوں سے بھی معمولی واقفیت حاصل تھی تو اس کے علم کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔

مثمر میں علم لغات سے بھی مفصل بحث ہے۔ خان آرزو نے اس میں لغات کے ان مسائل کا تقابلی مطالعہ کیا ہے جو کہ فرہنگ جہانگیری فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع میں بیان ہوئے ہیں۔ برہان قاطع پر انہوں نے بہت تنقید کی ہے، فرہنگ رشیدی کی بہت کم تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف فرہنگ جہانگیری کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔ اس طرح ہمیں مثمر میں ان لغات کا تقابلی مطالعہ بھی نظر آتا ہے

مثمر سے مولف کی ذکاوت کا پتا چلتا ہے اور ان اشعار کے متعلق جو مثمر میں نقل ہوئے ہیں اس کے تنقیدی نظریے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ آرزو کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ شعرا کے کلام کا تنقیدی مطالعہ کریں، لیکن اس ضمن میں انہوں نے جو کچھ مثمر میں لکھا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خان آرزو ایک بلند پایہ ناقد تھے۔ صاحب نظر عالم اور ایک قطعی نظریہ رکھنے والے ناقد بھی تھے جو فارسی زبان و عروض کے قواعد کے عین مطابق ہے۔ مختلف فارسی شعرا کے کلام پر انہوں نے جو شرحیں لکھی ہیں ان سے ان کے تنقیدی مشاہدات و نظریات اور ان کے گہرے مطالعے کا پتا چلتا ہے۔

مثمر میں خان آرزو نے تعریب، تفریس اور تہنید کے مسئلہ سے بحث کی ہے۔ تعریب و تفریس کے سلسلے میں ان کو اوّلیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، لیکن تہنید کے سلسلہ میں (فارسی الفاظ کو ہندی کے طریقے سے تبدیل کر دینا) ان سے پہلے کسی نے یہ نظریہ نہیں پیش کیا ہے، اس لیے انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

مثمر میں آرزو نے فارسی قواعد کے مسئلہ کو بہت تفصیل سے جانچا اور پرکھا ہے اس سلسلے میں بھی آرزو پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے نظریات کو بہترین طریقے سے پیش کیا ہے۔ اور ان مسئلوں کو نہایت خوبصورتی سے حل کیا ہے۔

مثمر میں کچھ ایسی تالیفات کا ذکر ملتا ہے جو ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ جیسے مجدالدین علی قوسی کی "فرہنگ قوسی"

مثمر میں آرزو کو ہندوستانی فارسی کا اچھا وکیل ثابت کرنے کے لیے خاصا مواد ملتا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ زبان جو کہ ایک زمانے تک ہندوستان جیسے عظیم برصغیر میں رائج ہو، اس میں ضرور ایسی خوبیاں ہوں گی جو اصلاً فارسی میں نہیں پائی جاتی ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود یہ درست نہ ہوتا اگر صرف

ہندستانی فارسی کی طرف ہی توجہ کی جاتی جیساکہ کچھ عالموں نے کیا ہے خان آرزو شاید پہلے عالم ہیں جنھوں نے توافق لسانین کے نظریے کو پیش کیا، یہ نظریہ دو طرح کا ہے۔ ایک فارسی اور کتابی ہندی کے ایک ہونے کا نظریہ اور دوسرا فارسی اور عربی کے ہم رشتہ زبان ہونے کا تصور۔ جہاں تک پہلے نظریہ کا تعلق ہے اس میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ اور مجموعی طور پر جو باتیں انہوں نے بیان کی ہیں، وہ بالکل صحیح ہیں۔ یہ نظریہ جو اب عام ہو گیا ہے سب سے پہلے خان آرزو کی بدولت ہی روشناس ہو سکا، لیکن ان کا دوسرا نظریہ یعنی عربی اور فارسی کے مماثل زبان ہونے کا تصور غلط ہے انہوں نے اس سلسلے میں جو باتیں لکھیں وہ دراصل غلط فہمی پر مبنی ہیں عربی اور فارسی ہم رشتہ زبانیں نہیں ہو سکتیں عربی سریانی اور فارسی آریائی خاندانوں سے متعلق ہیں۔ یہ دو الگ الگ خاندانوں کی زبانیں ہیں جو تاریخ کے کسی قدیم ترین دور میں بھی ایک نہیں تھیں، وہ فارسی اور عربی کے چند لفظوں کی مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ مماثلت کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، مگر جن فارسی لفظوں کو انہوں نے عربی لفظوں کے مماثل بتایا ہے وہ دراصل فارسی لفظ ہی نہیں ہیں بلکہ وہ پہلوی زبان کی ایک املائی صورت ہے جن کو اصطلاح میں ہزوارش کہتے ہیں

ہزوارش کے لغوی معنی گزارش اور شرح کے آتے ہیں لیکن اصطلاحاً اس کے مخصوص معنی ہیں۔ پہلوی زبان میں بہت سے سامی الفاظ ہیں جو اس کی ایک شاخ آرامی سے تعلق رکھتے ہیں اس طرح

کے الفاظ کی کتابت تو آرامی تلفظ کے اعتبار سے ہوتی ہے لیکن پڑھتے وقت اس کا متبادل پہلوی لفظ پڑھا جاتا ہے مثلاً جلتا لکھتے ہیں اور پوست پڑھتے ہیں، ملکا لکھتے ہیں اور شاہ پڑھتے ہیں، اب لکھتے ہیں اور بیت پڑھتے ہیں، ارخ لکھتے ہیں اور برات پڑھتے ہیں واضح ہو کہ یہ سامی کلمات عربی سے مشابہ ہیں جلتا جلد سے بدکا ملک ہے اور اب اور ارخ تو دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔

فارسی فرہنگ نویس خواہ وہ ایرانی ہوں یا ہندستانی قدیم ایران کی تاریخ اور وہاں کی زبانوں سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے تھے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس بارے میں ان کے اکثر بیانات اشتباہ پر مبنی ہیں۔ ہزوارش کے تصور سے وہ لوگ یکسر ناواقف تھے جیسا کہ یہ معلوم ہے کہ فارسی فرہنگ نویسوں میں صاحب فرہنگ جہانگیری اس غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مقالے برہان قاطع میں اس سے مفصل بحث کی[1] ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جمال الدین حسین انجوی شیرازی کو ایک قدیم کتاب کے اوراق نے گمراہی میں مبتلا کر دیا جو کسی زردتشتی کے پاس تھی، اس نے اس کتاب کے تمام لفظوں کو جو درحقیقت ہزوارش تھے، زند و پازند کے لفظ قرار دے کر اپنی فرہنگ میں شامل کر لیا۔ انجوی شیرازی کی پیروی میں محمد حسین بن خلف تبریزی صاحب برہان قاطع نے ان ہزوارش شکلوں کو زند و پازند کے لفظ قرار دیتے ہوئے اپنی فرہنگ میں حروف تہجی کے اعتبار سے فارسی کے اصیل لفظوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا حالانکہ انجوی شیرازی

۱۔ مجلہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جون - دسمبر ۱۹۶۹ء ص ۱۰۰۔

نے اتنی احتیاط برتی تھی کہ ان الفاظ کو اس نے ایک الگ فصل میں درج کیا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ اگرچہ وہ ان کو زند یا پازند کے الفاظ سمجھتا تھا لیکن ان کی اصل سے ناواقفیت کی بنا پر اسے ان الفاظ کو فارسی کے اصل الفاظ قرار دینے میں تامل ہوا کیونکہ ان کی عجیب وغریب شکلیں فارسی الفاظ کے سانچے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی تھیں، مگر خلف تبریزی نے بغیر کسی جرح اور تعدیل کے ان تمام ہزوارش شکلوں کو فارسی کے اصل الفاظ قرار دیا اور اس طرح فارسی زبان کو سخت نقصان پہنچایا۔ پروفیسر نذیر احمد نے چونکہ اس سلسلے کے سارے الفاظ اپنے مضمون میں جمع کر دیے ہیں اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے بارے میں ان کے اسی مضمون سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سراج الدین علی خان آرزو بارھویں صدی میں فارسی زبان وادب کے جید عالم تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ فارسی اور کتابی ہندی (سنسکرت) کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا جائے۔ اس کو وہ توافق لسانین کے نام سے اپنی مشہور لیکن غیر مطبوعہ کتاب مثمر میں بیان کرتے ہیں۔ یہ نظریہ بعد میں تمام مشرق ومغرب کے علماء کی تحقیق کی بنیاد بنا، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ آرزو کا قدیم ایرانی زبان کا مطالعہ ناقص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اوستا اور زند و پازند وغیرہ کے بارے میں انکی تشریح ناقص اور ان کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جیسے زرتشت جو مجوسیوں کا پیغمبر ہے اس کے بارے میں ان کے بیانات غلط اور یکطرفہ ہیں۔ اسی طرح ھزوارش کے

۱۔ فرہنگ جہانگیری ص ۹۶ ذیل لغت آذر

بارے میں بھی ان کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ انہوں نے فرہنگ جہانگیری
اور برہان قاطع کی پیروی میں ان کو زند و پازند کے الفاظ قرار دیکر
اپنی کتاب مثمر میں وہی سب باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حسین انجوی شیرازی
اور حسین تبریزی اپنی اپنی فرہنگوں میں بیان کر چکے تھے۔ نامناسب نہ ہوگا
اگر پہلے قدیم ایران کے متعلق ان کے وہ بیانات پیش کیے جائیں جو
غلط ہیں، اس کے بعد ان تمام ہزوارشں کی فہرست درج کی جائے جو انہوں
نے مثمر میں شامل کیے ہیں۔

گیومرت: مرکب است از گیو بکاف فارسی قلب بعض گوی و مرت
مبدل مرد یعنی مرد گویا، ان کا یہ استدلال غلط ہے، گیومرت دو کلمے سے
بنا ہے، گیو یعنی (زندگی) اور مرتن یعنی مردنی و درگذشتنی یعنی (مرنے اور
گذر جانے والا)[1] و مردم، پس اس کے معنی ہوئے زندگی مردم یا وہ
زندگی جو فانی ہے۔ دراصل گیو یعنی جان و زندگی اور مرتن صفت ہے
یعنی وہ چیز جو مرنے والی اور گذر جانے والی ہو۔ چونکہ آدمی فانی ہے
اس لیے گیومرت کہا گیا ہے۔

"قیاس می خواہد کہ زردشت اصل باشد و معنی آن دشمن زر
است، درین صورت لقب او خواہد بود، ابراھام نامش۔

اصل میں کلمہ زرتشت دو چیزوں پر مشتمل ہے، زرتہ و اشترہ یعنی دارندۂ
شتر زرد، بعض لوگوں نے آرزو کی طرح زرد تشت کو ابراہیم بتایا ہے اور

(۱) اس کے لیے مفصل بحث ڈاکٹر معین کی کتاب مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات فارسی
ص ۶۲ - ۶۳ پر ملتی ہے۔

اس کی کتاب اوستا کو صحفِ ابراہیم قرار دیا ہے، یہ بیان غلط ہے
نہ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور نہ لغت سے اس کی تائید ہوتی
ہے اس لیے ابراہیم اور ابراہام دراصل سریانی لفظ ہیں اور زرتشت
آریائی۔ اسی وجہ سے آریائی اور سریانی کا جوڑنا ممکن ہے۔

"نظر این حال کتاب اوستا است کہ ابراہیم زردشت آنرا
آوردہ وچون آن را نفہمیدند، شرح برآن نوشت موسوم بزند و
چون آنرا ہم نفہمیدند شرح آن را نیز نوشت مسمٰی بہ پازند وعجب
از زدچہ او دعوی پیغمبری داشت بزبان قوم حرف می زند تا بفہمند
واز آوردن کتابی کہ قوم آنرا نفہمند[1] چہ حاصل۔"

(اس کی مثال کتاب اوستا ہے جو ابراہیم زردشت کی لائی ہوئی
ہے اور چونکہ قوم نے اس کو نہ سمجھا تو اس نے زند کے نام سے
اس کی شرح لکھی جب لوگوں نے اس کو بھی نہ سمجھا تو اس نے
پازند نام سے اس کی شرح کی۔ اس کی یہ بات حیرت انگیز ہے
کہ وہ دعوی پیغمبری کرتا تھا اور پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے
ہیں تاکہ لوگ اس کی بات سمجھ سکیں۔ ایسی کتاب لانے سے کیا
فائدہ جس کو قوم نہ سمجھ سکے) یہ قول اغلاط کا مجموعہ ہے۔ آرزو قدیم ایران
کے مسائل سے واقف نہ تھے اس لیے اور دوسرے مصنفین کی طرح
وہ ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے، اس سلسلے کی تفصیل درج ذیل ہے
ا۔ زردشت کا نام ابراہیم نہیں، ہو سکتا اس سلسلے کی بات اوپر بیان

۱۔ رک مثمر قلمی ص ۸۰

کی جا چکی ہے۔

۲. اوستا کی شرح کا نام زند نہ تھا، بلکہ زند اوستا کی وہ شرح ہے جو پہلوی زبان میں لکھی گئی۔

۳. زند کا مصنف زردشت قرار دیا یہ صحیح نہیں ہے، اوستا کی شرح پہلوی زبان میں دور ساسانی میں لکھی گئی جو زردشت سے ہزاروں سال بعد کا دور ہے

۴۔ پازند، زند کی مخصوص شرح بتائی گئی ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے دراصل زند کی وہ روایت جس میں ہزوارشں کے بجائے اصل فارسی لفظ لکھ دیئے گئے ہوں پازند کہلاتی ہے اور اسلامی دور کی یادگار ہے جو زردشت کے زمانے کے ہزار سال بعد وجود میں آئی۔

۵۔ اوستا۔ زند اور پازند زردشت کی تصانیف قرار دی گئی ہیں نہ اوستا زردشت کی تصنیف ہے اور نہ زند و پازند، دراصل زردشت کے مذہب میں یہ آسمانی کتاب سمجھی گئی ہے لہذا اصولی طور پر اس کو زردشت کی کتاب قرار دینے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ زند نہ کوئی تصنیف ہے اور نہ یہ زردشت کی لکھی ہوئی ہے بلکہ اس کے سیکڑوں سال بعد وجود میں آئی یہی حال پازند کا بھی ہے۔

۶۔ متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوستا زند اور پازند کی ایک ہی زبان ہے، دراصل اوستا ایک متن ہے اور باقی زند

و پازند دو شرحیں، لیکن واقعہ ایسا ہے کہ اوستائی زبان زند و پازند کی زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ تینوں کی زبانوں میں بہت زیادہ تفاوت بھی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ آرزو قدیم ایران کے صحایف اور زبان کے بارے میں بُری طرح غلط فہمی کا شکار تھے۔

ذیل میں ہزوارش الفاظ کی بحث کی جاتی ہے۔ اول مثمر سے آرزو کا قول نقل کیا جاتا ہے۔ پھر برہان قاطع کی عبارت نقل ہوگی اور آخر میں اس کے ہزوارش کی نشان دہی کی جائے گی

۱۔ متراکہ در زبان پہلوی بمعنی باران است و در عربی مطر ربطای سند دارد"

برھانِ قاطع۔ متر ابلغت زند و پازند باران را گویند و بہ عربی مطر خوانند(۱)"

دراصل اس کے معنیٰ باران نہیں بلکہ یہ باران کا ہزوارش ہے پہلوی میں متر لفظ کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض آب کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ آب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۔ نیرا بجسر بمعنی آتش کہ بعربی نار گویند و غریب ترآنکہ نارہ در زبان ہندی کشمیری کہ مصداق دعوہ فان شیطانہ یتکلم با الھندیہ

۱۔ برھان ص ۱۹۶۵۔

باشند آتش را نار گویند و وجہ آن بخاطر رسیدہ لیکن بسبب دقت چون کم کسی خواہد فہمید ننوشتہ، باآنکہ در الفاظ دیگر مطلقاً اشتراک نیست۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند آتش را نار گویند و بعربی نار خوانند[1]

نار اس کے معنی نہیں بلکہ یہ نار کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں نیر لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ نار کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ نار محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۴۔ لیلیا: بمعنی شب کہ در عربی بمعنی لیل خوانند۔

برہان قاطع بلغت زند و پازند بمعنی شب است کہ عربی لیل را گویند[2]

شب اس کے معنی نہیں بلکہ یہ شب کا ہزوارش ہے پہلوی میں لیلیا لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ شب کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ شب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۵۔ تینا۔ بفوقانی بوزن مینا گل کہ بعربی طین گویند

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند گل را گویند و بعربی طین خوانند[3]

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے پہلوی میں تینا لفظ کا کوئی وجود نہیں۔

---

(۱) برہان ص ۲۲۲۴۔
(۲) ایضاً ص ۱۹۲۲۔
(۳) ایضاً ص ۵۴۷۔

یہ محض گُل کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ گُل محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۶۔ تین بفوقانی بمعنی انجیر کہ در عربی تین است۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند انجیر را گویند و در عربی نیز ہمین نام دارد[1]

واضح ہے کہ عربی اور آرامی میں یہ لفظ مشترک ہے ہزوارش آرامی ہے لیا گیا ہے نہ کہ عربی سے تین کے معنی دراصل انجیر نہیں بلکہ یہ انجیر کا ہزوارش ہے پہلوی میں تین لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ محض انجیر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ انجیر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۷) توپا: بفوقانی بواد معروف و پا رفارسی بمعنی سیب کہ بعربی تفاح است

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند سیب[2] را گویند عربی میں سیب کو تفاح کہتے ہیں گویا توپا اور تفاح کا مادہ مشترک ہے۔

دراصل توپا کے معنی سیب نہیں بلکہ یہ سیب کا ہزوارش ہے پہلوی میں توپا لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ محض سیب کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ سیب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۸۔ توم بفوقانی بوزن بوم بمعنی سیر کہ برادر پیاز است و بعربی ثوم و فوم بثاء مثلثہ و فا خوانند۔

برہان قاطع: توما بلغت زند و پا زند سیر برادر پیاز را گویند

۱۔ برہان ص ۵۴۷

۲۔ ایضاً ص ۵۲۶

بعربی توم و فوم خوانند.

دراصل سیر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سیر کا ھزوارش ہے پہلوی میں توم لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ محض سیر لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ سیر محض ھزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۹۔ سنت: بسین مہملہ و نون ہر دو متحرک بمعنی سال و سنتان جمع و بعربی سنہ گویند۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند سال است (یا سالہا) و بعربی سنن خوانند[۱]۔ ان ہزوارش الفاظ کی اصل آرامی لفظ شنتہ ہے جو عربی میں سنتہ یا سین غیر منقوطہ آیا ہے۔

دراصل سال اسکے معنی نہیں بلکہ یہ سال کا ہزوارش ہے، پہلوی میں سنت لفظ کا کوئی وجود نہیں ہے یہ محض سال کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سال محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۱۰۔ بتمن بکسر بای موحدہ و نون ساکن و فتح فوقانی و میم مفتوح و نون بمعنی دختر کہ بعربی بنت گویند۔

دراصل دختر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ دختر کا ہزوارش ہے پہلوی میں لفظ بتمن کا کوئی وجود نہیں یہ محض دختر کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ دختر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔ بعربی ابن گویند

۱۱۔ بتمن: ہماں حروف و اعراب با بدون فوقانی بمعنی پسر کہ بعربی ابن گویند

۱۔ برہان ص ۱۳۰۰

برہان قاطع : بلغت زند و پا زند پسر را گویند (۱)

بظاہر ابن عربی کا ہم ریشہ ہے

دراصل پسر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ پسر کا ہزوارش ہے۔

پہلوی میں لفظ بنمن کا کوئی وجود نہیں یہ محض پسر کے لکھنے کی شکل ہے

پہلوی میں لفظ پسر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۱۲۔ شمیا : بفتح سین معجمہ بمعنی آسمان کہ بعربی سیما است۔

دراصل آسمان اس کے معنی نہیں بلکہ یہ آسمان کا ہزوارش ہے پہلوی میں لفظ

شمیا کا کوئی وجود نہیں یہ محض آسمان کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ آسمان

محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۱۳۔ دمیا : بفتح اول و سکون میم و تحتانی بالف کشیدہ بمعنی خون کہ بعربی دم است

برہان قاطع : بلغت زند و پا زند خون را گویند و بعربی دم را خوانند (۲)

دراصل خون اس کے معنی نہیں بلکہ یہ خون کا ہزوارش ہے۔ لفظ دمیا کا پہلوی میں

کوئی وجود نہیں یہ محض خون کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ خون محض ہزوارش کے طور پر آیا

۱۴۔ دما : بکسر اول بمعنی رود خانہ کہ در عربی دأما بر وزن فعلا است بمعنی آب

برہان قاطع : بلغت زند و پا زند رود خانہ گویند (۳)

ڈاکٹر معین کا خیال ہے کہ یہ لفظ ہزوارش کی شکل نہیں بلکہ دساتیر

جو جعلی کتاب ہے اس سے ماخوذ ہے (۴)

۱۵۔ ملکا : بمعنی شاہ کہ بعربی ملک گویند۔

برہان قاطع : بلغت زند و پا زند پادشاہ را گویند

~~(۱) برہان ص ۲۱۰~~

۲۔ برہان ص ۸۸۱

(۳) ایضاً ص ۸۷۷

(۴) فرہنگ دساتیر ص ۲۴۵

دراصل پادشاہ اس کے معنی نہیں یہ پادشاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ ملکا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں یہ محض پادشاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پادشاہ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۱۶۔ شمشا: بمعنی زرد آلو کہ بعربی شمش گویند۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند نوعی از زرد آلو باشد[1]

دراصل زرد آلو اس کے معنی نہیں ہیں بلکہ یہ زرد آلو کا ہزوارش ہے لفظ شمشا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ہے یہ محض زرد آلو کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ زرد آلو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۱۷۔ کلبا کہ بعربی کلب است۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند بمعنی سگ باشد و بتازی کلب خوانند[2]۔

دراصل سگ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سگ کا ہزوارش ہے لفظ کلبا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ہے یہ محض سگ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سگ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۱۸۔ جلتا: بفتح بمعنی پوست کہ بعربی جلد است۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند پوست آدمی و حیوانات دیگر باشد و بعربی جلد گویند[3]۔

دراصل پوست اس کے معنی نہیں ہیں بلکہ یہ پوست کا ہزوارش ہے پہلوی میں جلتا کا کوئی وجود نہیں یہ محض پوست کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی

---

(۱) برہان ص ۲۰۱۷ (۲) ایضاً ص ۱۶۷۲ (۳) ایضاً ص ۸۱

میں لفظ پوست محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۱۹۔ ذکر: بمعنی نر کہ بعربی بعینہ ہمیں است و ازین دریافت می شود کہ سابق در فارسی ذال معجمہ بودہ حالا مطلق نیست چنانچہ بر محاورہ آن پوشیدہ نیست و این مخالف تحقیق سابق است و ظاہراً بزاء معجمہ است نہ ذال معجمہ۔

برہان قاطع: بلغت زند و پازند بمعنی نر باشد کہ در مقابل مادہ است و بعربی نیز ہمین معنی دارد۔ واضح رہے کہ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ بعض سامی زبانوں میں یہ لفظ اس معنی میں آتا ہے اور یہ ہزوارش سامی الاصل ہے۔

دراصل نر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ نر کا ہزوارش ہے پہلوی میں ذکر کا کوئی وجود نہیں، یہ محض نر لکھنے کی شکل ہے لفظ نر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۰۔ مزیا: بفتح میم و سکون زاء معجمہ تحتانی بالف کشیدہ بمعنی ترازو کہ بعربی میزان گویند۔

برہان قاطع: در برہان مزنا است۔ بلغت زند و پازند بمعنی ترازو باشد و بعربی میزان گویند[1]

دراصل ترازو اس کے معنی نہیں بلکہ یہ ترازو کا ہزوارش ہے پہلوی میں مزیا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض ترازو کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ ترازو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۲۔ بزدیہ بمعنی تخم کہ در عربی نیز بزر گویند

(۱) برہان ص ۲۰۰۲

برہان قاطع: بلغت زند و پازند تخم زراعت را گویند[1]

دراصل تخم اس کے معنی نہیں بلکہ یہ تخم کا ہزوارش ہے پہلوی میں بذر لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ محض تخم کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ تخم ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۳۔ ورتا: بواو فوقانی بمعنی گل کہ بعربی ورد است و ظاہراً ازہمین جہت ورد بمعنی گل را ائمہ فارسی گفتہ اند چنانکہ امام سیوطی در مزہر آوردہ و در محل خود بیاید۔

برہان قاطع: بلغت زند و پازند گل را گویند و بعربی ورد خوانند[2]

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں ورتا لفظ کا کوئی وجود نہیں یہ محض گل کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ گل محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۴۔ ارشیا: بمعنی سریر کہ بعربی عرش گویند

برہان قاطع: بلغت زند و پازند تخت و اورنگ شہان را گویند[3]

دراصل سریر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سریر کا ہزوارش ہے۔ لفظ ارشیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض سریر کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ سریر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۲۵۔ کذیا۔ بکاف تازی و سکون ذال بمعنی دروغ کہ بعربی کذب باشد۔

---

(۱) برہان ص ۲۷۲۔

(۲) ایضاً ص ۲۲۶ (۳) ... ایضاً ص ۱۰۵

برہانِ قاطع: بلغت زند و پازند بمعنی دروغ باشد و بعربی کذب خوانند

دراصل دروغ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ دروغ کا ہزوارش ہے، لفظ کذیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں بلکہ یہ محض دروغ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ دروغ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۶: شجاری: بفتح شین معجمہ وجیم تازی بالف کشیدہ ورای مہملہ بیارکشیدہ بمعنی درخت کہ بعربی شجر خوانند۔

برہان قاطع: در برہان شجار است۔ بلغت زند و پازند بمعنی درخت باشد کہ بزبان شجر گویند[2]

صاحب برہان کے خیال میں یہ نہ آیا کہ شجار کا رشتہ اسی شجر سے ہے۔ دراصل درخت اس کے معنی نہیں بلکہ یہ درخت کا ہزوارش ہے لفظ شجاری کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں یہ محض درخت کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ درخت محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۲۷: سیلچیل: بکسر اول و فتح یار فارسی وجیم فارسی بمعنی ہمی کہ میوہ است معروف و بعربی سفرجل گویند۔

دراصل میوہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ میوہ کا ہزوارش ہے، لفظ سیلچیل کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض میوہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں میوہ ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۲۸: شپتیا: بفتح اول و سکون بای فارسی و فوقانی بیارسیدہ و نون بالف کشیدہ بمعنی لب کہ بعربی شفت گویند۔

---

(۱) برہان ص ۱۶۰۴

(۲) ایضاً ص ۱۲۵۴

دراصل لب اس کے معنی نہیں، یہ لب کا ہزوارش ہے۔ لفظ شپتیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں یہ محض لب کے لکھنے کی شکل ہے لب پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۲۹۔ تبنا: بفتح فوقانی وسکون بای موحدہ ونون بالف کشیدہ بمعنی کاہ کہ در عربی تبن گویند۔

برہانِ قاطع: بلغت زند و پازند کاہی کہ اندر گندم وجو بہم رسد[1]

دراصل کاہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ کاہ کا ہزوارش ہے لفظ تبنا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں یہ محض کاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ کاہ پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۰۔ کالو۔ کالود: بمعنی کالبد کہ بعربی قالب خوانند وبعضی از فضلا گفتہ اند کہ قالب بکسر لام نیز آمدہ۔ لہذا شیخ سعدی شیراز قافیہ غالب آوردہ:

گر ہکی زین چہار شد غالب ... جان شیرین بر آید از قالب[2]

دراصل کالبد اس کے معنی نہیں بلکہ یہ کالبد کا ہزوارش ہے لفظ کالود کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ صرف کالبد کے لکھنے کی شکل ہے۔ کالبد پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۱۔ زابا: بزای معجمہ بالف کشیدہ بمعنی تلا کہ متاخران طلا نویسند و در عربی ذہب گویند۔

دراصل تلا اس کے معنی نہیں بلکہ یہ تلا کا ہزوارش ہے

---

(۱) برہان ص ۷۷۸۔

(۲) گلستان سعدی ص ۱۴۔

لفظ زا یا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ تلا کے لکھنے کی شکل ہے، تلا پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے

۳۲۔ اموتیا: بواو معروف و فوقانی مکسور و تحتانی بالف کشیدہ کنیز و پرستار کہ زن بود و بعربی امہ خوانند۔

دراصل کنیز و پرستار اس کے معنی نہیں بلکہ یہ کنیز و پرستار کا ہزوارش ہے۔ لفظ اموتیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ہے یہ صرف کنیز و پرستار کے لکھنے کی شکل ہے۔ کنیز و پرستار پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۳۔ ببا: بہر دو بای موحدہ مفتوح درخانہ کہ بعربی باب گوید

برہان قاطع: بروزن سبا، درخانہ و درسرا را گویند[1]

دراصل یہ پہلوی لفظ در کا ہزوارش ہے۔

۳۴۔ مدینا: بمعنی شہر کہ بعربی مدینہ گویند۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند بمعنی شہر است و بعربی مدینہ گویند[2]

دراصل یہ پہلوی لفظ شہر کا ہزوارش ہے۔

۳۵۔ یدمن: بفتح تحتانی و سکون دال وکسر میم و نون بمعنی دست کہ بعربی ید باشد۔

برہان قاطع: بلغت زند و پا زند بمعنی دست است کہ بعربی ید خوانند[3]

۱۔ برہان ص ۲۳۱
۲۔ ایضاً ص ۱۹۷۸
۳۔ ایضاً ص ۱۲۵

دراصل دست اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ دست کا ہزوارش ہے
لفظ یدمن کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ دست کے لکھنے کی شکل ہے
دست پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۶۔ زک: بفتح زاء معجمہ و سکون کاف تازی بمعنی آن شک کہ بعربی زف گویند

برہان قاطع: بلغت زند و پازند بمعنی آن باشد کہ کلمۂ اشارہ باشد[1]۔
عربی ذاک، ذلک کا ہم ریشہ ہے۔
دراصل آن اس کے معنی نہیں بلکہ یہ آن کا ہزوارش ہے لفظ زک کا
پہلوی میں کوئی وجود نہیں بلکہ یہ آن کے لکھنے کی شکل ہے۔ آن پہلوی
میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۷۔ سکینا: بوزن مدینا بمعنی کارد کہ بعربی سکّین بود بہ تشدید۔
دراصل کارد اس کے معنی نہیں بلکہ یہ پہلوی لفظ کارد کا ہزوارش ہے

۳۸۔ بتیا بکسر خانہ کہ بعربی بیت است۔
برہان قاطع: بلغت زند و پازند بمعنی خانہ است کہ بعربی بیت خوانند[2]
دراصل خانہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ خانہ کا ہزوارش ہے۔
لفظ بتیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں بلکہ یہ خانہ کے لکھنے کی شکل ہے
خانہ پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

۳۹۔ بیل و بیلا: بکسر چاہ کہ بتازی بیر خوانند۔
برہان قاطع: بلغت زند و پازند بمعنی چاہ کہ بعربی بیر خوانند[3]

---

(۱) برہان ص ۱۰۲۵ (۲) ایضاً ص ۲۲۱
(۳) ایضاً ص ۳۳۹۔

دراصل چاہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ چاہ کا ہزوارش ہے لفظ بیل و بیلا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ چاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ چاہ پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے خوب واضح ہو گیا کہ دراصل ہزوارش شکلوں کی اصلی قرأت جو عربی سے ملتی جلتی ہے تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقتاً وہ شکلیں حروف ہجی کے اعتبار سے پڑھنے کے لیے لکھی جاتی تھیں، لیکن پہلوی الفاظ کی مقررہ علامتوں کے طور پر سمجھی جاتی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی اصلی قرأت سے فارسی کے لفظ نہیں بنتے بلکہ وہ آرامی کے الفاظ تھے جو عربی کی طرح سریانی کی ایک شاخ ہے۔ پس ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فارسی اور عربی میں الفاظ کی گہری مماثلت ہے، اشتباہ پر مبنی ہے۔ اور اسی طرح یہ نتیجہ بھی غلط ہوگا کہ فارسی اور عربی میں توافق لسانین کارفرما ہے۔

مراجع

نام	کلکشن	سائز	اوراق	مصنف
دیوان آرزو (آزاد لائبریری)	حبیب گنج ف ۲۲ / ۷۷	۲۲ء۷×۸	۱م + ۲۹ حکایت منظوم	آرزو
ریاض الشعرا (آزاد لائبریری)	عبدالسلام ف ۹۳ / ۵۱	″۹ × ۱۲	۵۲۷	والہ داغستانی
سفینۂ خوشگو آزاد لائبریری	قلمی یونیورسٹی فا خبار ۳۴	″۸ء۷×۱۲	۲۸۷	بندرابن داس خوشگو
سراج اللغۃ	ذاتی دازحرف اوّل			آرزو
شرح خیابان گلستان سعدی	ضمیمۂ آرزو ۸۹۱/۵۵۲۵ / ۲۷	″۸ء۳×۴ء۴	۱۵	آرزو
شرح خیابان	آزاد ضمیمہ آرزو ۸۹۱/۵۵۲۵ / ۲۱	″۶×۸	۲۲	آرزو
شرح سکندرنامہ	″ ″			آرزو
مثمر	آزاد یونیورسٹی ف دلغات	۲۲ء۶×۱۱ء۷	۳۳۶	آرزو
مثمر	نیر عالم بکس ۳- ۲۱	۵ء۷×۹ء۶	۲۳۶	آرزو
مثمر	رضا لائبریری (رامپور)			آرزو
مثمر	خانۂ فرہنگی جمہوری اسلامی ایران دہلی نو			آرزو
مثمر	ذاکر حسین لائبریری (جامعہ)			آرزو
مثمر	بانکی پور			آرزو

مطبوعہ کتب

کتاب	مصنف	چاپ	سال طباعت
آب حیات	محمد حسین آزاد		
آتش کدہ	لطف علی بیگ آذر		
ادات الفضلا	قاضی بدر خان		
اقبال نامہ	نظامی گنجوی	ابن سینا	۱۳۲۵ شمسی
انیس العاشقین	رتن سنگھ زخمی		
برہان قاطع	محمد حسین بن خلف تبریزی		
(ج ۱، ۲، ۳، ۴، ۵)	(باہتمام معین) تہران		۱۳۴۲ شمسی
باغ معانی	نقش علی		
بزم سخن	علی حسن خان	آگرہ	۱۲۹۸ ہجری
بوستان		جاویدان	
تاریخ ادبیات در ایران	ذبیح اللہ صفا	ابن سینا	۱۹۶۲ عیسوی
تاریخ ادبیات ایران	رضازادہ شفق		
تاریخ بیہقی	ابوالفضل		
تاریخ فرح بخش			
تذکرۃ الشعرا	عبدالغنی		
تذکرۂ بے نظیر	عبدالوہاب افتخار	الٰہ آباد	۱۹۴۰ عیسوی
تذکرۂ حسینی	حسین دوست سنبھلی		

تذکرہ خوش معرکہ زیبا سعادت حسن خاں ناصر

تذکرہ ریختہ گویان فتح علی گردیزی اورنگ آباد ۱۹۳۳ عیسوی

تذکرہ شعرائے ہند فیلن وکریم الدین دہلی ۱۹۴۷ عیسوی

تذکرہ شعرائے اردو میر حسن دہلی ۱۹۴۰ عیسوی

تذکرہ گلشن سخن مردان علی خاں

چار شربت مرزا محمد حسن قتیل

چراغ ہدایت آرزو فتح الکریم

(حاشیہ غیاث اللغات)

چمنستان شعرا لچھمی نراین شفیق دہلی ۱۹۲۸ عیسوی

حدیقۃ الحقیقت سنائی غزنوی کلکتہ ۱۹۱۰ عیسوی

حیات میر تقی میر خواجہ احمد فاروقی

خزانۂ عامرہ غلام علی آزاد بلگرامی نول کشور کانپور ۱۱۷۶ ہجری

خیابان (شرح گلستان سعدی) آرزو مطبع الخلائق (دہلی) ۱۲۶۸ ہجری

دادِ سخن مولفہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اسلام آباد ۱۲۵۲ ہجری

دائرۃ المعارف اسلامی

دبستان المذاہب بمبئی ۱۲۷۷ ہجری

دستور الاخوان قاضی بدر خان

دستور الفصاحت احمد علی یکتا کے حواشی بتصحیح امتیاز علی عرشی ہندوستانی پریس رامپور

۱۹۴۳ عیسوی

دیوان ازرقی چھاپ نفیس

دیوان انوری — سعید نفیسی (مرتب) — پیروز — ۱۳۳۷ شمسی
دیوان امیر معزی
دیوان جامی — ہاشم رضی (مرتب) — پیروز — ۱۳۴۱ شمسی
دیوان حافظ — سب رنگ کتاب گھر نئی دہلی
دیوان حافظ — پروفیسر نذیر احمد (مرتب) — تہران
دیوان حافظ — سعید نفیسی (مرتب) — انجو
دیوان حافظ — محمد قزوینی (مرتب) — سینا، تہران
دیوان حزین — علی حزین — خیام — ۱۳۵۰ شمسی
دیوان حسینی — ناصرالدین شاہ حسینی
دیوانی سوزنی — نفیسی
دیوان رودکی — نفیسی
دیوان سعدی — نول کشور
دیوان سلمان ساوجی
دیوان صائب تبریزی — امیر فیروزکوہی (مرتب) عالی — ۱۳۳۶ شمسی
دیوان عبدالواسع جبلی — ذبیح اللہ صفا (مرتب)، بانک بازرگانی ۱۳۴۱ شمسی
دیوان عرفی — نول کشور
دیوان عنصری — بانک بازرگانی
دیوان غنی کشمیری — ملا طاہر غنی — جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی سرینگر
دیوان فرخی — سپہر تہران
دیوان فلکی شروانی — آذر
دیوان کمال اسماعیل — حسین بحر العلومی (مرتب) کتابفروشی دہخدا — ۱۳۴۸ شمسی

دیوان کمال خجندی کمال خجندی تبریز (چاپ خانہ شفق)

دیوان منوچہری منوچہر دامغانی سپہر (تہران)

دیوان ناصر خسرو نول کشور ۱۹۶۷ عیسوی

دیوان نظیری نیشاپوری مظاہر مصفا (مرتب) کتابخانہ امیر ۱۳۴۰ شمسی

رقعات آرزو خان آرزو

روز روشن صدیق حسن خاں گوپالی

سہ نثر ظہوری

شاہنامہ (ج ۱)

شرف نامہ گنجوی (سکندر نامہ) نظامی (ابن سینا) ارمغان ۱۳۱۶ شمسی

شرف نامہ گنجوی نظامی شرق ۱۳۴۵ شمسی

شرف نامہ منیری ابراہیم قوام فاروقی (مصحح ڈاکٹر طارق حسن) ۱۹۷۰ عیسوی

صحاح الفرس محمد بن ہندو شاہ نخجوانی تہران ۱۳۴۱ شمسی

صحف ابراہیم علی ابراہیم خان خلیل

صراح و قراح محمد احمد علی کانپور

عقد ثریا غلام علی ہمدانی مصحفی دہلی ۱۹۳۴ عیسوی

عوارف المعارف شیخ شہاب الدین سہروردی

غرائب اللغۃ

غیاث اللغۃ مولانا غیاث الملۃ والدین فتح الکریم

فارسی ادب بعہد اورنگ زیب۔ نور الحسن انصاری دہلی ۱۹۶۹ عیسوی

فردوسی پر چار مقالے شیروانی

فرہنگ امثال الحکم / فرہنگ امثال سید مسعود حسن رضوی / علی اکبر دہخدا کتاب گھر ۱۹۵۸ عیسوی

فرہنگ جہانگیری حسین انجوی شیرازی
فرہنگ رشیدی عبدالرشید تتوی۔
فرہنگ عوام
کلیات حزیں علی حزیں نول کشور کانپور
کلیات سعدی محمد علی فروغی (مرتب) انتشارات جاویدان
گل رعنا لچھمی نرائن شفیق
گلستان سعدی نوراللہ ایران پرست (مرتب)، دانش ۱۳۴۸ شمسی
گلشن ہند مرزا علی لطف لاہور ۱۹۰۶ عیسوی
گل عجائب اسد علی تمنا اورنگ آباد ۱۹۳۵ عیسوی
لغت فرس سروری۔ ابو منصور علی بن احمد اسدی طوسی (باہتمام پاول ہورن
۱۸۹۷ عیسوی
لغت نامہ دہخدا (ج ۱) مجلس ۱۳۲۵ شمسی
لباب الالباب حمداللہ مستوفی
لکھنو کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی
ماثر الامرا
ماثر الکرام آزاد بلگرامی دخانی (لاہور) ۱۹۱۳ عیسوی
مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات فارسی محمد معین دانشگاہ ۱۳۲۶ شمسی
مجموعۂ نغز قدرت اللہ قاسم
مجمع الفصحا رضا قلی خان ہدایت
مجمع الفرس سروری کاشی
مخزن الاسرار نظامی گنجوی شرق ۱۳۴۴ شمسی

مخزن نکات قایم چاندپوری اورنگ آباد

مدارالافاضل (ج ۱، ۲) اللہ داد فیضی سرہندی (باہتمام محمد باقر) لاہور ۱۳۵۵ شمسی

مردم دیدہ حاکم لاہوری لاہور ۱۹۶۱ عیسوی

مراۃ الاصطلاحات آنندرام مخلص

مزھر جلال الدین سیوطی (عربی) بر ۱۳۸۲ شمسی

معیار جمالی شمس فخری

مقدمہ نوادرالالفاظ عبدالواسع ہانسوی

مویدالفضلا لاد دہلوی

میر کی آپ بیتی ۔ میر تقی میر

نزہت القلوب حمداللہ مستوفی بریل ۱۳۳۱ شمسی

نشتر عشق حسین قلی خان عظیم آبادی۔

نکات الشعرا میر تقی میر اورنگ آباد ۱۹۳۵ عیسوی

نوادرالالفاظ۔ عبدالواسع ہانسوی

ہفت اقلیم (ج ۱، ۲، ۳) امین احمد رازی علی اکبر علمی

مجلّات	سال طباعت
ادیب	جنوری ۱۹۴۳ عیسوی
انڈو ایرانیکا	۱۹۶۰ عیسوی
اورنٹیل کالج میگزین	نومبر ۱۹۵۰ عیسوی
رسالہ اردو	جولائی ۱۹۴۳ عیسوی
معارف	اگست ستمبر ۱۹۴۱ عیسوی

معاصر (معارضۂ حزین و آرزو، منوہر سہائے) پٹنہ
نگار جولائی ۱۹۳۲ عیسوی
نگار نومبر، دسمبر ۱۹۴۰ عیسوی
نقوش (سالنامہ) جنوری ۱۹۶۳ عیسوی
نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۲ عیسوی
نیا دور نومبر ۱۹۶۰ عیسوی
راہنمای کتاب شمارہ ۸، ۱۳۵۴ شمسی

انگریزی کتب و کیٹلاگ

انڈیا آفس کیٹلاگ ج ۲ ایتھے
بانکی پور کیٹلاگ عبدالمقتدر
برلن کیٹلاگ
برٹش میوزیم کیٹلاگ ریو
پرشین لٹریچر سی، اے، اسٹوری
جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بلاک مین
آف بنگال
سراج الدین علی خان آرزو، ہز لائف اینڈ ورکس منوہر سہائے انور
شیخ محمد علی حزین، ہز لائف، ٹائمز اینڈ ورکس، سرفراز خاں، لاہور ۱۹۴۴ عیسوی
ظہوری ہز لائف اینڈ ورکس۔ پروفیسر نذیر احمد الہ آباد ۱۹۵۳ عیسوی

فہرست